ظفر عظیم
پریم گیت کی
بکھری ہوئی خوشبو
اور دیگر کہانیاں

پیشِ خدمت ہے "کتب خانہ" گروپ
کی طرف سے ایک اور کتاب

پیشِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔ گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
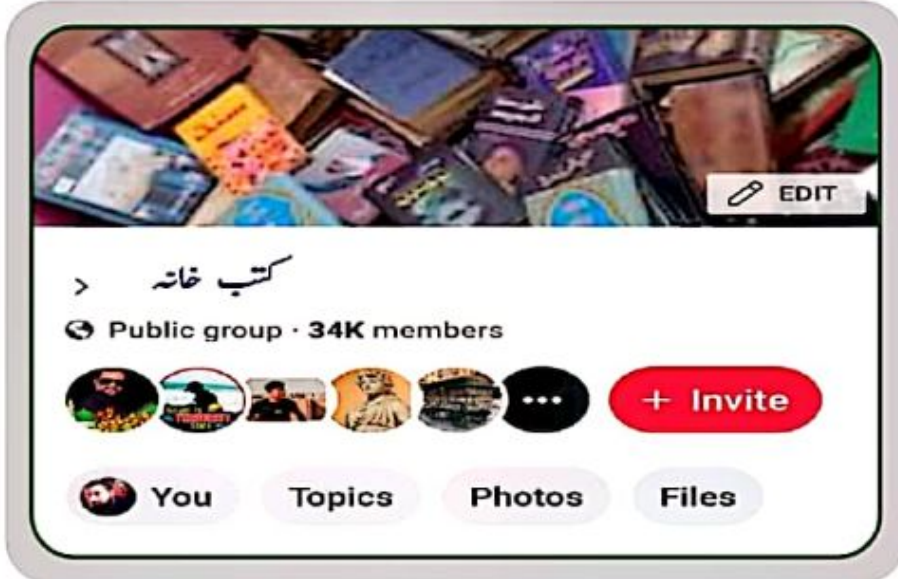
عقابی : +923055198538

محمد اطہر اقبال : +923340004895

محمد قاسم : +971543824582

میاں شاہد عمران : +923478784098

میر ظہیر عباس روستمانی : +923072128068

پریم گیت کی بکھری ہوئی خوشبو

اور

دیگر کہانیاں

ظفر اعظم

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Zafar Azeem
Praim Geet Ki Bikhri Howi Khoshbo
Aur Diger Kahanian/ Zafar Azeem.-
Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2010.
183pp.
1. Urdu Literature - Short Stories.
I. Title.

2010

نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2300-8
ISBN-13: 978-969-35-2300-3

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 37220100-37228143 Fax: 37245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز لاہور

منزہ ظفر، نیلم ظفر

اور

کنول ظفر کے نام

اظہار تشکر

میں مندرجہ ذیل لوگوں کا شکر گزار ہوں:

جناب چوہدری عظیم الدین صاحب کا جنہوں نے ہر قدم پر رہنمائی کی۔

جناب اظہر جاوید صاحب'

جناب محمد علی صدیقی صاحب'

جناب راشد ملک صاحب' جن کا تعاون ہمیشہ حاصل رہا۔

اور

جناب محمد صدیق صاحب کا جنہوں نے بہت محنت سے اسے کمپوز کیا۔

ان کہانیوں میں کردار، جگہیں اور مختلف ادارے فرضی ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی مشابہت محض اتفاقیہ ہے اور اس کا مقصد کسی کی کردار کشی نہیں۔

ترتیب

پریم گیت کی بکھری ہوئی خوشبو

شاید کسی نے کہا تھا یا والٹر پیٹر نے یا خلیل جبران نے کہ چاہت تعلق کو نبھانے کے سوا کسی اور شے کی متمنی نہیں ہوتی۔ اپنے گداز انداز میں یہ اس ندی کی طرح ہے جو صبح سے شام تک محوِ حرکت ہو کر اپنا نغمہ الاپتی ہے اور پندار کے حصار کو توڑ کر اپنے بیکراں دل کے ساتھ چاہت کی ہر نئی صبح کو خوش آمدید کہتی ہے۔

موسم بہار کے ایک خوشگوار دن تمام لوگ ایک الوداعی کھانے پر ہوٹل ھالیڈے ان میں اکٹھے ہوئے تھے۔ یہ کھانا کاروبار میں کامیابیوں کی خوشی میں دیا گیا تھا۔ سب لوگ اپنی اپنی کارکردگی پر بے حد مسرور تھے۔ عجیب بات تھی کہ حاضرین محفل جن کا تعلق ایک ہی ادارے سے تھا اس کھانے پر پہلی دفعہ اکٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ اکثر لوگ ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں تھے۔ اب وہ ایک دوسرے کے شناسا بننے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہمیشہ کی طرح وہ گرد و پیش سے بے خبر ایک کونے میں اکیلا ہی کھڑا تھا۔ اچانک ایک خاتون کی گھورتی اور مسکراتی ہوئی آنکھوں نے اسے اپنے خیالات کی دنیا سے باہر کھینچ لیا۔

''یہ میرا تعارفی کارڈ ہے۔'' مسکراتے ہوئے اس نے اپنا کارڈ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''شکریہ!''

''اس میں شکریے کی کیا بات ہے۔ آیئے ساتھ بیٹھ کر کافی پیتے ہیں۔''

اس ملاقات کے کچھ ہی دنوں بعد انہیں ساتھ کام کرنے کا ایک اور موقع مل گیا۔ کام کی تفصیلات طے کرنے کے لیے ہفتہ کے روز دونوں مل بیٹھے۔ دوران گفتگو وہ ایک دوسرے میں محو ہو کر رہ گئے۔ کیوپڈ دیوتا نے اپنی مدھر آواز میں پریم گیت گوالاپنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی بیٹھک جلد ہی ختم ہو گئی حالانکہ دونوں کی خواہش تھی کہ یہ ملاقات کبھی ختم نہ ہو۔

اتوار کا دن تھا اور وہ موسیقی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اچانک ٹیلی فون

کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''آپ کیسے ہیں؟'' اس کی سریلی آواز سنائی دی۔

''میں خیریت سے ہوں۔ چھٹی کا دن ہے اور موسیقی سنی جا رہی ہے۔ آپ تو جانتی ہی ہیں کہ موسیقی سننے میں کیا لطف آتا ہے اور کبھی کبھار موسیقی سنتے سنتے آپ کو تخلیقی لمحہ آ دبوچتا ہے۔ آج ایسے ہی لمحے میں ایک خوش انداز خیال نے جنم لیا ہے۔''

''بہت خوب۔ ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ آپ بھی تخلیق کار ہیں۔ ماجرا کیا ہے؟ ہمیں بھی تو اس انوکھے خیال کا پتہ چلے۔''

''کیا یہ ممکن ہوگا کہ آپ کل شام کا کھانا میرے ساتھ 'کیفے کوروش' میں نوش فرمائیں؟''

''کل! کیا آنے والے کل میں کوئی خاص بات ہے؟''

''آپ کا جنم دن ہے بھئی!!''

''اف خدایا مجھے تو یاد ہی نہیں تھا۔''

''میرے دوست کل 25 نومبر کا دن ہے!''

''آپ کو مان گئے بھئی۔ میرا جنم دن کل ہی ہے۔ میں کل شام کو کیفے کوروش پہنچ جاؤں گی۔ آپ کی چاہت کا شکریہ!''

دن ڈھل چکا تھا۔ افق پر سورج کی کرنوں کی زردی ابھی تک موجود تھی۔ ہوا دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ دریا کے کنارے کیفے کوروش کی رونقیں عروج پر تھیں۔ لوگ اپنے ہم جولیوں کے ہمراہ ہنستے اور مسکراتے ہوئے جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ کئی لوگ دوستوں کی قربتوں کا لطف اٹھا رہے تھے۔ وہ بھی ایک کنارے پر بیٹھا اس کا منتظر تھا اور سوچ رہا تھا کہ مردوں سے انتظار کروانا عورتوں کا یقینی حق ہے۔

کچھ ہی دیر بعد وہ کیفے میں داخل ہو رہی تھی۔ ''دیر سے آنے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔'' اس نے آتے ہی کہا۔ ''اس حرکت کے لیے میں قصوروار

نہیں ہوں۔ آج دفتر کے مسائل گھمبیرتا کے شکار تھے اور سڑکوں پر شام کی ریل پیل کچھ زیادہ ہی تھی اس بناء پر گھر پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ جنم دن کے لیے کپڑوں کا انتخاب ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ اس میں بھی کچھ وقت لگا۔ معاف کیجئے گا۔''

''اوہ چھوڑو بھئی۔ تکلف کی کیا بات ہے۔ نہ آنے سے دیر سے آنا ہزار درجہ بہتر ہے۔''

اس نے اپنا کوٹ اتار کر ٹانک دیا۔ کرسی پر بیٹھ کر وہ پرسکون انداز میں کیفے کے ماحول سے آشنا ہونے کی کوشش کررہی تھی۔

''آپ کیا پینا پسند کریں گی؟ انار کارس یا کچھ اور؟''

آنکھیں بند کر کے وہ چٹخارے لیتے ہوئے بولی۔''انار کا رس مجھے بہت پسند ہے۔''

خدمت گار نے جونہی کھانوں کی فہرست میز پر رکھی تو وہ چونکے۔

''میں نے آپ کے لیے کچھ مخصوص کھانوں کا انتخاب کیا ہے۔''

''بہت بہت شکریہ۔''

اس کا انداز گفتگو آج نرالا ہی تھا۔ وہ شوخ و چنچل باتیں کر رہی تھی۔ اس کی باتوں کی چہک نے محفل کو رنگین بنا دیا تھا۔

اچانک وہ کہنے لگی۔ ''برا مت منایئے گا صاحب کچھ دنوں سے میں محسوس کر رہی ہوں کہ آپ کا رویہ دوستی کی حدوں کو پھلانگ رہا ہے! یاد رکھیں ہمارے درمیان دوستی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہمارے معاشرے میں شناسائی تو بہت آسان ہے لیکن دوستی میں کچھ وقت لگتا ہے۔ ہمیں ان سماجی رویوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ نے جو کچھ محسوس کیا اس میں کوئی سچائی نہیں۔ دوستی میں ناصح ہونا اچھی بات نہیں ہمیں تو آپس میں چارہ سازی اور غم گساری کی بات کرنی چاہیے۔ ان باتوں کو چھوڑیں اور اپنے جنم دن پر میری جانب سے اک معمولی سا تحفہ قبول کیجئے۔''

اس نے پیکٹ کھولا تو چمکتے اور اٹھلاتے ہوئے حسین بندے کچھ زیادہ ہی نازکی دکھا رہے تھے۔

''میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں تم سے کوئی تحفہ قبول نہیں کروں گی لیکن آپ کی وضاحت کے بعد میں اسے قبول کرتی ہوں۔ شکریہ۔''

جونہی اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بولنے سے منع کیا اور کہنے لگی۔ ''اب اس معاملے پر مزید بحث نہیں ہوگی۔''

ماحول میں اداسی گھسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ آج کی گفتگو نے اسے پریشان کر دیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد اس نے کہا: ''میں اجازت چاہوں گا۔''

''جی نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کا گھر نزدیک ہی ہے۔ میں آپ کو گھر تک چھوڑ دوں گی۔''

''شکریہ! اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''یہاں جھگڑا کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔''

کچھ ہی دیر بعد دونوں ریستوراں سے باہر نکل گئے۔

گردو پیش کے ماحول سے بے خبر وہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ آج کی گفتگو نے اسے ذہنی طور پر پریشان کر دیا تھا۔ وہ اس کی طرف شرارت بھری نظروں سے تک رہی تھی۔ اسے کچھ خبر نہ تھی۔ سرگوشی کے انداز میں وہ کہنے لگی ''بھئی کیا آپس میں چھیڑ چھاڑ نہیں کی جا سکتی؟'' ذہن میں خیالات کی بھرمار کی وجہ سے وہ ان الفاظ کو سن ہی نہیں سکا۔ جونہی گاڑی رکی وہ نیچے اترا اور گھر کی طرف بھاگا۔ وہ اس کی حرکتوں پر مسکرا رہی تھی۔

اگلے روز بھی اس کی قسمت کا ستارہ گردش میں ہی تھا۔ وہ دفتر سے غیر حاضر تھی اور اس کا دل دفتری کاموں سے اچاٹ ہو چکا تھا۔

شام کو گھر واپس آتے ہوئے اس نے ایک نوعمر لڑکی کو دیوار پر کچھ لکھتے ہوئے دیکھا۔ قریب آنے پر اسے اس کا پیغام نظر آیا جو اس نے اپنے محبوب کے لیے لکھا تھا۔ ''بیوقوف تمہیں اتنا بھی احساس نہیں کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔'' پیغام پڑھ کر وہ چونکا۔ اسے ایک دم خیال آیا کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بھی اس سے پیار کرتی ہو؟ اور اس کی گفتگو چھیڑ چھاڑ کا ہی حصہ ہو۔

کبھی کبھی ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہمارا بچپن ہمارے درون خانہ رہائش پذیر ہے۔ بچپن جو ماضی میں زندہ حقیقت تھا آج بھی ہمارے احساسات کے ساتھ ساتھ ہمسفر ہے۔ جب کبھی پر لطف لمحے زندگی سے ٹکراتے ہیں تو ہمارا بچپن انہیں خوش آمدید کہنے کے لیے ماضی سے حال میں لوٹ آتا ہے۔

وہ دونوں کھانے کے لیے ایک ریستوراں میں گئے۔ کھانے کے دوران وہ خاموش تھے۔ وقت تھم چکا تھا۔ پریم گیت کی خوشبو چاروں اور پھیلی ہوئی تھی۔ اسے صرف اس کی مسکراتی ہوئی بھوری آنکھیں نظر آ رہی تھیں جہاں چاہت کی کشش کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ یہ احساس حیران کن تھا اس سے قبل اسے کبھی ایسی ترنگ کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ دوستی زندگی کے نئے مفاہیم تراش رہی تھی۔ پریم گیت نے آرزؤں کو جگانا شروع کر دیا تھا۔

یہ ایک روشن دن تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی دلفریب ہوا چل رہی تھی۔ وہ اسے شہر کی منڈی دکھانا چاہتی تھی۔ وہ راضی برضا اس کے ہمراہ روانہ ہو گیا۔ اسے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں اور کب منزل مقصود پر پہنچے۔ اس کے پیار کا نشہ اس کے انگ انگ میں سرایت کر چکا تھا۔ منڈی پہنچتے ہی اس نے کہا: ''آؤ بھئی چلیں۔'' ''میں آپ کے ساتھ ہی تو ہوں۔'' وہ کہنے لگا۔

''یہ منڈی کسی زمانہ میں مضافات کے کسانوں کے لیے تعمیر کی گئی تھی تا کہ لوگ وہاں سبزیاں اور پھل فروخت کر سکیں۔ اب اس جگہ پر دیگر اشیاء کی چھوٹی چھوٹی دکانیں کھل چکی تھیں اور طرح طرح کی چیزیں خریدنے کے لیے دستیاب تھیں۔ خریدار زیادہ تر سیاح ہی تھے۔

وہ منڈی میں دھیرے دھیرے ٹہل رہے تھے۔ ٹہلتے ٹہلتے خاصا وقت گزر چکا تھا۔ دوپہر کے کھانے کی بھوک بیدار ہو چکی تھی۔ انہوں نے کھانے کے لیے ''چندر ما بھوگ'' نامی ریستوراں کو چنا۔ کھانے کے دوران وہ اس منڈی کے بارے میں مزید تفصیلات بیان کرتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں بھی عکس پڑ رہے تھے۔ اور وہ اس کی چاہت کے نشے میں گم تھا۔ لوگ انہیں دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

کھانے کے بعد چہل قدمی کرتے ہوئے وہ اشوک ہوٹل جا پہنچے۔ وہاں گرما گرم ایسپریسو کافی پی گئی۔ دونوں کو ایک ان دیکھی مسرت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ گزرتے ہوئے لمحے کبھی ختم نہ ہوں۔ رات کے کھانے پر جام صحت تجویز کرتے ہوئے اس نے کہا: ''اس کے لیے جس کے پیار کی چنگاری نے یہاں جنم لیا۔ یہ چنگاری دھیرے دھیرے مچلتی اور پھولتی رہی۔ آج پیار کی یہ چنگاری وقت اور مکاں سے ماورا ہو کر ہمیشہ کے لیے امر ہو چکی ہے۔''

وہ کہنے لگی۔ ''آپ کی گفتگو اتنی دلچسپ ہوتی ہے کہ من کو خوشی محسوس ہوتی ہے۔ آپ نے جن الفاظ سے مجھے نوازا ہے آنے والے دنوں میں اس پیغام کی شکتی مجھے چاشنی دیتی رہے گی۔ تھوڑے سے دن جو ہم نے ایک ساتھ گزارے ہیں ان میں آپ کی قربت نے مجھے روحانی خوشی دی ہے۔ اور آپ .... ہوا کے اس تازہ جھونکے کی مانند ہیں جو دل و جاں کو راحت بخشتا ہے۔''

''اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت'' وہ کہنے لگا۔

یہ سن کر وہ مسکرادی۔

باہر اندھیرا ہو چکا تھا۔ ہوا کی خنکی میں دھیرے دھیرے اضافہ ہو رہا تھا۔ اور وہ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر آپس کی باتوں میں کھوئے ہوئے تھے۔

اس کے اصرار پر وہ ایک جوتشی خاتون سے ملنے گئے۔ جوتشی خاتون اپنے دفتر میں ان کی منتظر تھی۔ جیسے ہی وہ دفتر میں داخل ہوئے وہ مسکرانے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ کہنے لگی:

'' تم دونوں کا یہاں آنا کوئی اَنہونی کی بات نہیں ہے۔ اس سے تمہیں

یہاں موجود ہونا ہی تھا۔ قسمت کی دیوی کا یہ ہی حکم تھا۔ ایک دوسرے کی صحبت میں گزرتے ہوئے لمحے تمہارے لیے یقیناً خوشگوار ہوں گے کیوں کہ راحت اور خوشی دیوتاؤں کی طرف سے تمہاری چاہت کے لیے تحفہ ہے۔ لیکن یہ مسرت کے لمحے دائمی نہیں بلکہ عارضی ہیں اور آپ لوگوں کو ان سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔'' کچھ دیر کے لیے وہ خاموش ہوئی اور پھر کہنے لگی:

''تم دونوں ایک کشش سے بندھ گئے ہو اور یہ کشش دھیرے دھیرے پیار کو بڑھا دے گی اور تم ایک دوسرے میں کھو کر رہ جاؤ گے۔ لیکن قسمت نے تمہارا ملاپ نہیں رکھا ہے۔ تمہارے دائرہ اختیار سے باہر قوتیں جدائی کے لمحے لائیں گی۔ اس دوری ہی میں تمہارئی بھلائی ہے۔ سمے کا بھرپور فائدہ اٹھاؤ۔ جدائی کا وقت آئے تو خوشی خوشی ایک دوسرے کو الوداع کہہ دینا۔ مشکل تو ہوگی لیکن ہونی کو کون روک سکتا ہے۔''

دونوں مسکراتے ہوئے اپنی راہ لگ لئے۔

رات کی تنہائی میں وہ اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا اچانک اسے یاد آیا کہ برسوں پہلے ایک دست شناس نے اسے کہا تھا: ''مستقبل میں کچھ عرصہ تمہیں اپنے خاندان سے دور رہنا پڑے گا اس دوران تمہاری ملاقات ایک بھوری

آنکھوں والی حسین دوشیزہ سے ہوگی۔ شاید یہ کشش عارضی ثابت ہو لیکن تم دونوں کبھی بھی ایک دوسرے کو بھلا نہیں سکو گے۔''

حیراں حیراں ہو کر وہ سوچ رہا تھا۔ ''یہ کیسا اتفاق ہے؟''

تازہ ہوا کے جھونکے فرحت بخش رہے تھے۔ یہ ایک روشن اور حسین دن تھا اچانک دروازے کی گھنٹی بجی۔ وہ باہر آیا۔ ڈاکیا اس کے لیے ایک خط لیے ہوئے کھڑا تھا۔ خط کی تحریر اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اسی کا کوئی پیغام تھا۔ معلوم نہیں اس چٹھی میں اس کے لیے کیا تحریر تھا؟

اس نے چٹھی کو پڑھا۔ گو تحریر میں چاشنی تھی لیکن پیغام میں اپنائیت نہیں تھی۔ آپس کے تال میل میں بھروسے اور اعتماد کی کمی ظاہر ہو رہی تھی۔ پیار کی چمک گہنا چکی تھی۔ کیوں؟ اسے معلوم نہ تھا۔ اس نے فون اٹھا کر اس کا نمبر گھمایا۔

''ہیلو''

''ہاں تم کیسی ہو؟''

''تمہاری آواز میں آج اجنبیت کیوں ہے بھئی؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''معاف کرنا تمہارا خط ملا لیکن معاملہ چوپٹ معلوم ہو رہا ہے۔ کیا یہ ممکن ہوگا کہ ہم کچھ دیر ساتھ گزاریں؟''

''بھئی تم کچھ بھی نہیں سمجھتے۔''

''کیوں؟''

''تم ہی بتاؤ میں ایک اجنبی پر کیسے اعتبار کروں جبکہ وہ شرارتوں پر تلا ہوا ہو۔''

''میں اس معاملے میں سنجیدہ ہوں۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ تعلقات میں اعتبار کی کمی ہے!''

''میں بھی اس معاملے میں کافی سنجیدہ ہوں۔ میں کسی کی پرواہ نہیں

کرتی۔ میں نے تمہیں جو خط لکھا ہے اسے تحریر کرنے کے لیے غور و فکر میں تین روز لگے۔ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پا رہے!!!''

''تمہارے خط میں بھی تو اپنائیت کی کوئی بات نہیں؟''

''بھئی میں سونے جا رہی ہوں۔ بہتر ہوگا ہم کل بات کریں۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

اس نے شہر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کبھی کبھار زندگی کے اہم فیصلے غلط فہمی اور ایک دوسرے کو نہ سمجھنے سے بھی ہوتے ہیں۔ اس کے انداز اس کی سمجھ سے باہر تھے اور ذہنی تناؤ کا شکار ہو چکا تھا۔

اس کی روانگی سے ایک ہفتہ قبل وہ دوبارہ مل بیٹھے۔

''کیا تم واقعی جا رہے ہو؟''

''ہاں''

''لیکن کیوں؟''

''نئی جگہ پر اپنا کاروبار شروع کرنا چاہتا ہوں۔''

''یہاں کیوں نہیں؟''

''ہر جگہ کی اپنی خصوصیات ہیں اور میرے خیال میں نئی جگہ میرے کاروبار کے لیے مناسب اور موزوں ہے۔

گزرے ہوئے عرصہ میں میری مصروفیات کچھ زیادہ ہی تھیں لیکن اب میں فارغ ہوں اور میرے پاس ملنے جلنے کے لیے زیادہ وقت ہوگا۔ تم ٹھہر کیوں نہیں جاتے۔

''اس تجویز پر غور کروں گا۔''

ماحول میں اداسی اور گہری ہو چکی تھی۔

روانگی سے ایک دن قبل وہ ملنے آئی۔ اس کے چہرے سے اداسی اور

مایوسی ظاہر تھی۔ان کی وابستگی ٹوٹ رہی تھی۔کسی میں بھی اتنی جرات نہیں تھی کہ وہ اپنے حقیقی احساسات کا اظہار کر سکے۔

ان کا تعلق ٹوٹ گیا۔وہ بھول رہے تھے کہ موسیقی کی مدھر دھنیں جب ٹوٹ جاتی ہیں تو موسیقی دیر تک ذہن میں گونجتی رہتی ہے۔

ایک روشن اور حسین دن۔خنک ہوا چل رہی تھی۔مرکز شہر کی منڈی میں ایک جوڑا داخل ہوا۔لڑکی دراز قد' خوبصورت اور مسکراتی ہوئی بھوری آنکھوں کی مالکہ تھی۔وہ ماحول سے آشنا معلوم ہو رہی تھی۔وہ سیدھی 'چندر ما بھوگ' نامی کھانے کی دکان پر گئی۔اس نے کھانے کی فہرست کا مطالعہ شروع کر دیا۔اس کا ساتھی برابر میں ایک مصور کی دکان میں چلا گیا۔

خاتون نے برگر اور سلاد خریدنے کا اظہار کیا۔دوکان کی مالکہ اس سے کہنے لگی: ''آج تم ایک سال کے بعد یہاں آئی ہو!''

''ہاں ایسا ہی ہے۔''

''مجھے نومبر کا وہ دن بھی یاد ہے جب تم ایک گندمی رنگ کے نوجوان

کے ساتھ یہاں آئی تھیں۔اس دن گفتگو کے دوران تم مسلسل قہقہے لگا رہی تھیں۔ ہمارے لیے تم لوگوں کی محویت کا نظارہ حسین تھا۔گو تم دونوں چاہت کے سحر میں گرفتار تھے لیکن مجھے یقین ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے احساسات کو سمجھ نہیں پا رہے تھے۔"

''ہاں کچھ ایسا ہی تھا۔"

''چاہت وہ شے ہے جس کا خیال کرنا پڑتا ہے۔اسے بھی خوراک' پانی' دیکھ بھال اور اپنی طرز کی نمو کی ضرورت ہوتی ہے۔چاہت تمہاری آنکھوں کی روشنی سے ہٹ کر رقص کرتی ہے۔اس کا عقلی تجزیہ نہیں کیا جاسکتا اور اگر تم ایسا کرو گے تو یہ تحلیل ہو جائیگی اور تم لوگ پیار جیسی قیمتی شے کھو بیٹھو گے۔

''کیا کھانا تیار ہے؟''اس کے ساتھی نے آواز لگائی۔

''جی جناب تیار ہے۔"

خاتون نے کھانے کا تھیلا اٹھالیا اور وہ اپنے ساتھی کے ہمراہ دھیرے دھیرے منڈی سے باہر چلی گئی۔

یہ وہی جگہ تھی جہاں ''چندر ما بھوگ'' نامی کھانوں کا مرکز تھا۔ ایک جوڑا ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ کچھ دیر بعد گندمی رنگ اور کالی آنکھوں والا نوجوان ریستوراں میں داخل ہوا۔ اس نے کھانا چننے کے لیے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا اور برگر اور سلاد خریدنے کا فیصلہ کیا۔

دوکان کی مالکہ اس سے کہنے لگی۔ ''شاید تم اس دوکان پر پچھلے سال نومبر میں آئے تھے۔''

''جی ہاں۔'' نوجوان نے کہا۔

''مجھے آج بھی مسکراتی ہوئی بھوری آنکھوں والی تمہاری حسین ساتھی یاد ہے، جس کے ساتھ اس روز تم اپنی موج میں مسکرا مسکرا کر گفتگو کر رہے تھے۔

''آپ ایک شاندار یادداشت کی مالکہ ہیں۔''

''بھئی انوکھی اور موجی قسم کے لوگ ہر روز تو نہیں ملتے۔ انہیں تو کبھی کبھار ہی دیکھ کر محسوس کیا جا سکتا ہے۔''

نوجوان نے ایک گہرا سانس لیا اور کہنے لگا۔ ''کیا کریں زندگی اسی کا نام ہے۔ سب کچھ ہی سہنہ پڑتا ہے۔''

اس کی ساتھی نے آتے ہی کہا۔ ''کیا کھانا تیار ہے؟''

''جی ہاں محترمہ! کھانا تیار ہے۔''

انہوں نے کھانا لیا اور دھیرے دھیرے منڈی سے باہر چلے گئے۔

رات ہو چکی تھی۔ اندھیرا گہرا ہو رہا تھا اور چاروں اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سمندر پرسکون تھا اور سمندر کنارا ویران تھا۔ درختوں کے عقب سے چاند نے دھیرے دھیرے ابھرنا شروع کیا۔ اس پر فضا ماحول میں یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ اجڑی ہوئی دنیا ہے یا فردوس بریں۔ وہ دونوں اپنے اپنے خیالوں میں مگن سمندر کنارے خاموش کھڑے ہوئے تھے۔

اسے وہ لمحے آج بھی یاد تھے جب اس نے آگے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا تھا۔ تب اس نے کہا تھا۔ ''تم اجنبیوں کی طرح کسی اور جانب دیکھنا شروع کر دیتی ہو تو مجھے ایسے لگتا ہے جیسے تم اپنی دنیا میں

واپس چلی جاؤ گی اور میں تمہیں کبھی نہ پا سکوں گا۔"

اس نے کہا تھا۔"میں تمہاری ہوں!!!"

وہ اس کی بھوری آنکھوں کی پہنائیوں میں گم تھا۔ ہمیشہ کی طرح مسکراتی ہوئی آنکھیں جہاں اپنائیت اور محبت امڈ رہی تھی۔

جس انداز سے وہ اسے چھوا کرتی تھی وہ اک نرالا انداز تھا۔ گفتگو سے قبل وہ ہمیشہ چائے پیا کرتی اور اکثر اس کے بالوں کو بکھیر دیا کرتی تھی۔ یہ سب کچھ اس کے ذہن میں ابھی تک تر و تازہ تھا۔

وہ دل ہی دل میں کہنے لگا۔"اس کا انداز دلفریب اور ساحرانہ تھا۔"

پھر وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

"رات ڈوب رہی ہے میرے محبوب آؤ اب گھر چلیں۔" اس کی ساتھی کی آواز نے اس کے خیالات کا تانا بانا بکھیر دیا۔

''چلو بھئی چلو۔''

سورج ڈوب رہا تھا اور اس کی کرنیں جھیل کے پانی کو منور کر رہی تھیں۔ جھیل ایک سونے کے پیالے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ خنک ہوا چل رہی تھی۔ پرندے اپنے گھونسلوں کی جانب رواں دواں تھے۔ وہ دونوں پام کے درخت کے نیچے خاموش اور اپنے اپنے خیالات میں گم کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ان کالی آنکھوں کو آج تک نہیں بھلا سکی تھی۔ محبوبانہ انداز سے اسے خوش آمدید کہنا مگر اپنی چاہت کا اظہار نہ کرنا۔ اس کے نرالے انداز آج بھی ذہن میں موجود تھے۔ اس کی آنکھوں سے امڈتے ہوئے پیار کی شدت اکثر اسے غصہ دلا دیتی تھی لیکن اس شدت میں دلچسپی کی نسبت غصے کا اظہار معمولی بات تھی۔ اسے آج بھی سنہری سمندر کنارے کی سیر یاد تھی۔ جہاں ایک شام اس نے اسے حیران کر دیا تھا۔

''کیا تم نے آج کے غیر معمولی پن کو محسوس کیا ہے؟''

''ابھی تک تو نہیں۔''

''یہ ناقابلِ یقین ہے۔''

''لیکن ہے کیا؟''

اس نے اس کے چہرے کو آہستہ سے اپنی ہتھیلیوں میں تھام لیا اور کہنے لگا۔ کیا تمہیں نظر نہیں آ رہا کہ ہم دونوں یہاں اکٹھے ہیں اور چندر ما اور تارے ہمیں مبارک باد دے رہے ہیں۔

اسے یوں لگا جیسے وہ ہوا کے دوش اڑ رہی ہے۔

''کیا یہ حقیقت ہے؟''

جونہی اس خیال نے اس کے ذہن میں جنم لیا ایک پراسرار خوشبو چاروں اور پھیل گئی اور اسے ہر شے اچھی لگنے لگی۔

''رات ڈھل چکی پیاری۔ آؤ اب چلیں۔''

اور وہ دونوں دھیرے دھیرے اک ان دیکھی منزل کی جانب چل دیئے۔

ہونی ہو کر رہتی ہے

لال کوٹ نامی قصبہ دریا کنارے پہاڑوں کے دامن میں بسا ہوا ہے۔
ان دنوں بی جن وہاں پر بطور تفشیشی افسر تعینات تھا۔ بی جن کا بنیادی کام جرائم کی تفشیش تھی۔ ان جرائم میں معصومیت، بذلہ سنجی ڈرامائی طور طریقے سے ہیرو بننے کا شوق، بدلہ لینا اور صدیوں سے موجود دلوں میں چھپی نفرت شامل تھے۔

اپنے کام کے دوران بی جن کو اکثر آریاؤں کی اس روایت کا سامنا کرنا پڑا کہ اجنبیوں کو ان کے معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ وہ آج بھی اجنبیوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ایک دن بی جن کو اطلاع ملی کہ قصبہ کے شمالی کنارے رہنے والی بڑھیا اک پراسرار شخصیت ہے۔ اس کے بارے قسم قسم کی باتیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کچھ کا

کہنا تھا کہ وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ بھی سنا جا رہا تھا کہ وہ جوتشی ہے اور لوگوں کو آنے والے سمے کے بارے بتاتی ہے۔

علاقہ مجسٹریٹ کو بھی اس بڑھیا کے بارے شکایت کی گئی۔ اس شکایت کی چھان بین بھی بی جن کے حوالے کر دی گئی۔ بڑھیا کے خلاف لوگوں نے دھوکہ دہی اور غلط پیشنگوئی کرنے کے الزام لگائے تھے۔ ان حالات میں بی جن کو بڑھیا کے بارے جانکاری کے لیے سنجیدہ ہونا پڑا اور یوں بی جن نے اس کے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔

بڑھیا کے گھر پہنچ کر بی جن نے دروازے پر دستک دی۔ کچھ ہی سمے بعد سفید رنگ کا لباس پہنے ایک پستہ قد بڑھیا گھر سے باہر نکلی۔ وہ شکل وصورت سے بنجارن معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر جھریاں پھیلی ہوئی تھیں اور سفید بال بے ہنگم انداز میں بکھرے ہوئے تھے۔ ہاں چہرے پر بھورے رنگ کی مسکراتی ہوئی آنکھیں نمایاں تھیں۔

''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟'' خاتون نے بی جن سے پوچھا۔

''کیا جوتشن گھر پر ہیں؟''

اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ ''میں آپ کے سامنے موجود ہوں۔ تمہیں یہاں آنے کے لیے کس نے کہا ہے؟''

''علم جوتش کی پراسراریت مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔'' بی جن نے کہا۔

''میں ایک جوتشی ہوں اور کوشش کرتی ہوں کہ لوگوں کے ذہنوں میں چھپے ہوئے وسوسوں اور منفی خیالات کو کم کرسکوں۔ تم کیا جاننا چاہتے ہو؟''

''میں علم جوتش پر یقین نہیں رکھتا۔''

''یہاں آ ہی گئے ہو تو آؤ تمہاری جنم کنڈلی دیکھ لیتے ہیں!!'' بڑھیا نے مسکراتے ہوئے اسے دعوت دی۔

''ٹھیک ہے۔'' بی جن نے کہا۔

جوتشن بی جن کو مکان کی اندرونی بیٹھک میں لے آئی۔ وہاں بچھے

ہوئے صوفے اور کرسیوں کے کشن پھٹے ہوئے تھے۔مکڑی کے جالے ہر اور جھول رہے تھے۔دو کتابیں جن پر ''ستاروں کی چال'' کے الفاظ لکھے ہوئے تھے کمرے کے مرکز میں رکھی میز کے کنارے بجی ہوئی تھیں۔

''آؤ بیٹھو۔''

بی جن کرسی پر بیٹھ تو گیا مگر اس کے دماغ میں ایک انجان بے کلی کی کیفیت نے سر اٹھایا اور وہ گہری اداسی کی طرف پھسلنے لگا۔

''اپنا جنم دن، جنم بھومی اور جنم کے سمے کو تحریر کردو۔'' جوتشن نے اس سے کہا۔

''۲۶ اکتوبر ۱۹۵۶ء بمقام قصور بوقت پانچ بج کر پینتالیس منٹ صبح۔'' بی جن نے یہ تحریر بڑھیا کے حوالے کر دی۔

جوتشی بڑھیا نے جنتری کی مدد سے بی جن کی جنم کنڈلی بنائی اور اس کے مطالعہ میں کھو کر رہ گئی۔

بی جن بیقراری کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک اس نے جوتشی خاتون سے پوچھا۔ ''کیا تم کسی شے کو گھور رہی ہو۔''

''جی ہاں! تمہاری جنم کنڈلی میں ستاروں کی چال کو دیکھ رہی ہوں۔ اس علم کو ہی جوتش یا نجوم کہتے ہیں۔ اسے سمجھنے کا طریقہ کار وہی ہے جو لوگ کسی بھی فن کو سمجھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جیسے موسیقار اپنے فن کو سمجھنے کے لیے موسیقی کے فلسفہ اور سازوں کی بنت کا مطالعہ کرتا ہے اور ان کی عملی تکنیک کو سمجھتا ہے اور سیکھتا ہے کہ کس طرح اس کا من پسند ساز موسیقی کو تخلیق کرتا ہے؟ اسی طرح لکھاری لفاظی اور گرائمر سیکھتا ہے اور ایک منفرد انداز بناتا ہے۔ اسی انداز میں مصور تصویر اور اس کے مجوزہ ڈیزائن کے طریقہ کار پر عبور حاصل کرتا ہے۔ علم جوتش کو سیکھنے کے لیے بھی یہی انداز اپنانا ہوتا ہے۔

''تمہارا کہنا ہے کہ جوتش بھی علم کی ایک باقاعدہ شاخ ہے؟'' بی جن نے بڑھیا سے پوچھا۔

''جی ہاں۔ آج سے چند سو سال پہلے تک جوتش اور فلکیات ایک ہی علم سمجھے جاتے تھے۔ ستاروں کی چال جاننے کے لیے آج بھی جوتشی وہی جدول استعمال کرتے ہیں جسے علم فلکیات کے ماہرین ستاروں کا راستہ کہتے ہیں۔ اصل

بات یہ ہے کہ ایک جوتشی اپنے سائل کی فطری اور جبلی فطرت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہ اس کا سماج میں کیا مقام ہوگا۔ اور وہ کس پیشے کی جانکاری سے شہرت حاصل کرے گا۔ اور یہ بھی اندازہ لگایا جاتا ہے کہ وہ شخص دوسروں سے کس طرح کا میل ملاپ رکھے گا۔"

"اچھا۔۔۔ اب میں سمجھا۔ یہ جنم کنڈلی آنے والے کل کے واقعات بتاتی ہے۔"

"جی ہاں کسی کے جنم سے آکاش میں ستارے اور ان کے جھرمٹ کی ترتیب کا نقشہ کنڈلی کہلاتا ہے۔ ستاروں کے جھرمٹ میں ستاروں کی درست مقام پر موجودگی سے ہی لوگوں کے کردار کا پتہ چلتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس شخص کے جیون میں کیا اتار چڑھاؤ آئیں گے اور اس کو درپیش جوار بھاٹا کے دوران ستاروں کا یہ جھرمٹ کس انداز میں اس کی ذمہ داریوں میں کمی یا اضافہ کرے گا؟"

"اگر میں جوتش کی منطق کو سمجھ پایا ہوں تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کے پاس کوئی آزادی نہیں ہے۔ اور اس کا ہر عمل پہلے سے لکھ دیا گیا ہے۔"

وہ کہنے لگی: ''میں ایسے کئی لوگوں سے ملی ہوں جنہیں یقین تھا کہ ان کی زندگی میں آنے والے بھونچال کو صبح ازل ہی لکھ دیا گیا تھا اور ان کی تفصیل جاننے کے لیے انہیں ایک جوتشی کے پاس جا کر اپنی جنم کنڈلی میں چھپے ہوئے رازوں کو جاننا ہوتا ہے۔ مگر میں اس بات پر یقین نہیں رکھتی۔ کیونکہ ہمارا وجود اسی صورت میں مفاہیم حاصل کرتا ہے جب ہم ان مفاہیم سے ہم آہنگ ہوتے ہیں اور ان خفیہ سرگوشیوں کو سن پاتے ہیں جو آپ کی ذات کے اندر سموئی ہوئی ہیں۔''

پی جن کے ذہن میں اسے مزید کریدنے کی خواہش بڑھ رہی تھی۔ مگر وہ تھی کہ جنم کنڈلی کو باریک بینی سے دیکھنے میں مصروف تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی انجانی دنیا کا نظارہ کر رہی ہے۔ اچانک اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ اس کی آنکھیں تیزی سے بند اور کھلنے لگیں۔ کچھ دیر بعد وہ پی جن کی طرف متوجہ ہوئی اور مسکرا کر کہنے لگی: ''اوپر والا ہی سارے بھیدوں کو جانتا ہے۔ اس کے بندے اس کے رازوں کو سمجھنے کی شکتی نہیں رکھتے۔ میرے علم کے مطابق تمہاری جنم کنڈلی جو تصویر پیش کر رہی ہے وہ عجیب و غریب ہے۔ تم نام، پیسہ اور عزت تو کماؤ گے۔ جنم کنڈلی کے مطابق مشتری تمہارے دسویں گھر میں بیٹھا ہوا ہے اور کرہ آسمان سے بہت قریب ہے ساتھ ہی ساتھ یہ مریخ کو بھی مثبت نظر سے دیکھ رہا ہے۔ مریخ تمہارے چھٹے گھر کا مالک ہے اور وہ شان و شوکت کے ساتھ اپنے ہی گھر یعنی حمل میں براجمان ہے۔ علم جوتش کے مطابق

تمہاری گھریلو زندگی ناخوشگوار گزرے گی۔ کیونکہ ستارہ زہرہ کا تعلق تمہاری گھریلو زندگی سے ہے اور وہ ستارہ عقرب کو بری نظر سے دیکھ رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یورینس کو جو تمہارے ساتویں گھر میں موجود ہے مخالف نظر سے دیکھ رہا ہے۔ ستاروں کی یہ چال بتاتی ہے کہ تمہارے جیون میں کٹھنایاں آئیں گی۔ تمہاری بیوی کا جیون کے بارے نظریہ بدل جائے گا۔ یوں تمہاری گھریلو زندگی چوپٹ ہو کر رہ جائے گی۔ ہونی کو کوئی نہیں روک سکتا اور نہ ہی اس کا راستہ بدلا جا سکتا ہے۔"

یہ سن کر بی جن سناٹے میں آ گیا۔

"اس کنڈلی کو آئندہ ساتھ لانا۔ اب کچھ پوچھنا ہے تو پوچھو!" بڑھیا نے کہا۔

"میں اپنی بیوی سے بہت پیار کرتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے جنم کنڈلی کے حساب کتاب میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔ جیون کی ان راہوں کو دوبارہ دیکھنا ہو گا۔"

"جیون کی ان لیکھاؤں کو کوئی بدل نہیں سکتا۔" وہ کہنے لگی۔

"میں سمے کا قائل ہوں اور آنے والے کل کے بارے کہی ہوئی باتوں پر وشواس نہیں رکھتا۔ مجھے بھروسہ ہے کہ میں اور میری پتنی اپنی راہ میں آنے والی ہر کھٹنائی

کو دور کرنے کی شکتی رکھتے ہیں۔" یہ کہہ کر بی جن جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

کچھ دنوں بعد بی جن مجسٹریٹ کی عدالت میں اپنے ساتھ پیش آئے ہوئے واقعات کو بیان کر رہا تھا۔ مجسٹریٹ جوتشن کی بتائی ہوئی باتیں سن کر حیران رہ گیا اور بی جن سے کہنے لگا۔ "اپنی جنم کنڈلی دکھاؤ گے؟"

بی جن نے کنڈلی مجسٹریٹ کے سامنے پھیلا دی۔

اس نے کنڈلی کو غور سے دیکھا اور کہنے لگا: "جوتشن جھوٹی ہے۔ یہ بڑھیا لوگوں کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہی ہے اور من گھڑت باتیں بنا کر ان سے پیسے بٹور رہی ہے۔"

بی جن نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور اپنے بارے کہی گئی باتوں کے بارے اپنے شکوک وشبہات کا اظہار کرنے لگا۔

"میں بھی جوتش کا علم جانتا ہوں۔" مجسٹریٹ کہنے لگا: "جوتشی بڑھیا کی اس بات سے میں اتفاق کرتا ہوں کہ تم نام، پیسہ اور عزت کماؤ گے۔ "تمہاری شادی ختم ہو جائے گی" اس بات کو میں نہیں مانتا۔" تمہاری جنم کنڈلی

میں ستاروں کی چال بتا رہی ہے کہ تمہارا بندھن مضبوط ہے۔ کنڈلی میں زہرہ سر افق ہے اور پانچویں گھر میں زحل کے ساتھ محبت کی نظر سے دیکھ رہا ہے کنڈلی کے یہ زاویے جذباتی خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ زہرہ کی چال یورینس کے ساتھ بھی چھٹے گھر میں شانتی کی نظر ڈال رہی ہے۔ ہر دو چال یعنی زہرہ قرآن زحل قرآن یورینس کو ہم خوش قسمتی کا نشان بھی کہتے ہیں اور یہ نشان ہی زہرہ کی وینس کے ساتھ مخالف نگاہ کے منفی اثرات کو زائل کرے گا۔ تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔''

''علم جوتش سوائے حماقت کے اور کچھ نہیں ہے۔ جوتشی بڑھیا مکار اور جھوٹی ہے۔'' بی جن کہنے لگا۔

ان معاملات کی روشنی میں مجسٹریٹ نے جوتشی بڑھیا کو عدالت میں طلب کر لیا۔

پیشی کے روز جوتشی بڑھیا عدالت میں حاضر تھی۔ اسے نوسر بازی اور دھوکہ دہی کے الزامات کا سامنا تھا۔ اس نے اپنے خلاف لگائے گئے الزامات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ایک پیشہ ور جوتشی ہے اور اپنے گاہکوں کی جیون راہوں میں آئی ہوئی رکاوٹوں کو دور کرتی ہے۔

بی جن بطور تفشیشی افسر عدالت میں پیش ہوا۔ اس نے جوتشی بڑھیا کے خلاف گواہی دی اور ان تمام واقعات کو عدالت میں بیان کیا جو جوتشی بڑھیا سے ملن کے دوران اسے پیش آئے تھے۔ اس نے عدالت کو جوتشی بڑھیا کی پیشن گوئیاں بھی سنائیں اور کہنے لگا کہ یہ پیشن گوئیاں غلط اور بے بنیاد ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ جھوٹی پیشن گوئیاں کرنے کا کام مکاری اور دھوکہ دہی ہے۔

بڑھیا نے اپنے خلاف لگائے گئے الزامات کو جھوٹوں کا پلندہ کہا۔ اور کہنے لگی کہ علم جوتش کے جانے پہچانے قواعد کے مطابق اس کے احکامات بالکل درست ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے خلاف شکایت جلن اور نفرت کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ اس نے عدالت سے درخواست کی کہ اس کے خلاف کارروائی کو ختم کیا جائے۔

عدالت نے بڑھیا کے خیالات سے اتفاق نہیں کیا اور مجسٹریٹ نے دھوکہ دہی کے الزام میں اسے جرمانے کی سزا سنا دی۔ اور یہ حکم بھی جاری کیا کہ وہ فوری طور پر قصبہ چھوڑ کر کسی اور جگہ چلی جائے۔

ارنج والم کا چہرہ لیے جوتشی بڑھیا عدالت سے رخصت ہوئی۔

کہتے ہیں سے تیزی سے سفر کرتا ہے۔ دن اور رات گزرتے چلے

گئے ۔اور دھیرے دھیرے لوگ جوتشی بڑھیا کی کہانی کو بھول گئے ۔

چھٹی کے دن مجسٹریٹ کلب میں آیا۔اس نے دیکھا کہ بی جن ایک کونے میں تنہا اور اداس بیٹھا ہوا ہے۔'' کیسے ہو بھائی ؟'' مجسٹریٹ نے اس سے پوچھا: '' کافی دنوں سے تم سے ملاقات نہیں ہوئی ۔کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

'' جناب زندگی اتفاقات سے بھری ہوئی ہے اور میں بھی اتفاقات زمانہ کا شکار ہوں۔''

'' کیسا اتفاق؟'' مجسٹریٹ نے پوچھا۔

'' کچھ سے پہلے آپ نے ایک جوتشی بڑھیا کو سزا سنائی تھی جس نے میرے آنے والے کل کے بارے پیشن گوئی کی تھی ۔یاد ہے آپ کو؟''

''ہاں مجھے یاد ہے۔''

''اس جوتشی بڑھیا کی بتائی ہوئی باتیں بالکل ٹھیک نکلیں ۔یوں لگتا ہے

کہ میری بیوی مجھ سے مطمئن نہیں تھی۔ وہ بدیس سے آئے ہوئے ایک نوجوان کے پریم میں گرفتار ہوگئی۔ اس نے مجھے چھوڑ کر اس نوجوان سے شادی کر لی اور بدیس پدھار گئی۔ جس روز اس نے ملک چھوڑا اسی روز میری ترقی کے احکامات جاری ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ میری ذات میں کچھ نہ کچھ کمی تھی جس کی بنا پر میری بیوی نے مجھے چھوڑ دیا۔ جوتشی بڑھیا کی پیشن گوئیوں کا اس اتفاقیہ واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

مجسٹریٹ کے چہرے پر حیرت کے آثار ابھرے اور وہ سکتے میں آ گیا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں سامنے لٹکی ہوئی تختی کو گھور رہی تھیں جہاں نوبل انعام یافتہ بنگالی شاعر ٹیگور کے یہ الفاظ درج تھے:

"آیا تھا میں جس گیت کو گانے
گا نہ سکا ہوں اسے آج تک
ساز کے تاروں کو توڑنے جوڑنے میں
گزاری ہے زندگی میں نے
آیا ہی نہیں ہے مناسب سے ابھی
اسی لیے میرا گیت نامکمل ہی رہا
جل رہا ہے دل میرا مایا کی آگ میں"

چلنے کا نام ہے زندگی

ہمالیہ پہاڑ کے دامن میں واقع اس خوبصورت وادی کے درمیان سے سانپ کی طرح بل کھاتی سڑک بلندیوں میں جا کر کہیں گم ہو جاتی ہے۔ اس وادی میں ہی کسی وقت مشہور زمانہ شہر ٹیکسلا آباد تھا۔ وہی شہر جو آریاورت کے عظیم شہنشاہ اشوک اعظم کا شمالی مغربی ہندوستان کا دارالخلافہ تھا۔ شہر کے پھیلے ہوئے کھنڈرات آج بھی اس کے سنہرے ماضی کی داستان سنانے کے لیے موجود ہیں۔ اس جگہ کے باسی روایتی کھیتی باڑی میں مشغول ہیں۔ ہزاروں سال سے ان کے رہن سہن میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ چاروں اور بسی ہوئی غربت نے علاقے کو آسیب زدہ کرر کھا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وقت تھما ہوا ہے۔

کالج کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر میں اپنے خاندانی کاروبار میں مصروف ہو

چکا تھا اور کارخانہ لگانے کے لیے میں اس وادی میں مناسب جگہ خریدنے کے لیے ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ وادی میں کئی دنوں سے موسم ابر آلود تھا اور ہوا کافی تیز چل رہی تھی۔ جگہ ڈھونڈھنے کی مٹر گشتی کے دوران اچانک موسلا دھار بارش ہونے لگی اور چاروں اور اندھیرا چھا گیا۔ میری کار کچھ دیر تو چلتی رہی اور پھر ایک جھٹکا کھا کر رک گئی۔ انجن بند ہو چکا تھا۔ چاروں اور اندھیرا چھایا ہوا تھا اور وقت کا کچھ پتہ نہ تھا۔ اچانک کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر دیکھا تو ایک شخص کار کے قریب کھڑا دکھائی دیا۔ میں نے اس سے پوچھا: ''اجنبی کون ہو تم؟''

''جی حضور میں چوکیدار ہوں۔ کار کی بتیوں کو جلتا ہوا دیکھ کر یہاں آ گیا۔''

''میری گاڑی خراب ہو گئی ہے اور میں طوفان کے ختم ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اس علاقہ کا موسم غیر یقینی ہے۔ اکثر کئی کئی دن بلکہ ہفتوں تک خراب ہی رہتا ہے۔ کسی بھی وقت موسم مزید خراب ہو سکتا ہے۔ انتظار بے سود ہے۔ قریب ہی ایک چھوٹا سا ریسٹ ہاؤس ہے۔ آرام دہ جگہ ہے۔ موسم کے ٹھیک

ہونے تک وہاں ٹھہرنا مناسب رہے گا۔"

تجویز بڑھیا تھی۔ میں نے کار کو چوکیدار کی مدد سے ایک کونے میں کھڑا کر دیا اور ریسٹ ہاؤس کی جانب چل دیا۔

ریسٹ ہاؤس میں میزبان کونہ سامنے ہی نظر آ رہا تھا۔ مہمانوں کی آسانی کے لیے اسے دروازے کے قریب ہی ترتیب دیا گیا تھا۔

"میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟" میزبان کلرک کہنے لگا۔

"رات بسر کرنے کے لیے کمرہ چاہیے۔"

"اس فارم میں اپنی جان پہچان درج کریں۔" میزبان کلرک نے کہا۔

میں نے فارم پر کر کے اسے میزبان کلرک کے حوالے کر دیا اور کمرے کی چابی ملنے کے انتظار میں لاؤنج میں جا کر بیٹھ گیا۔ لاؤنج کو بھورے اور حنائی رنگوں سے سجایا گیا تھا۔ اس کے مرکز میں چھ آرام دہ کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔

سامنے کی دیوار پر ایک تختی نصب تھی۔ جس پر کچھ تحریر تھا۔ دور سے تحریر کو پڑھنا مشکل تھا۔ جونہی میں نے اسے پڑھنے کا سوچا اسی وقت میزبان کلرک میرے پاس آ کر کہنے لگا: ''یہ آپ کے کمرے کی چابی ہے۔''

''شکریہ۔''

کمرہ آرام دہ تھا۔ بستر پر لیٹ کر میں گزرے ہوئے دن کے بارے غور کرنے لگا۔ دھیرے دھیرے احساس ہونے لگا کہ آج کا دن بھی بھاری تھا۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا آیا سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا؟ اچانک کمرے کا دروازہ کھل گیا اور ایک شخص ہاتھ میں نیزہ لیے اندر داخل ہوا۔ اس نے قدیم زمانے کا لباس پہنا ہوا تھا۔ وہ تعظیمی انداز میں جھکا اور کہنے لگا: ''شہر ٹیکسلا میں آنے کا شکریہ۔ آج تم جولیاں یونیورسٹی کے مہمان خصوصی ہو۔ اپنا لباس تبدیل کرو اور میرے ساتھ چلو۔''

میں اس کے حکم کی تعمیل کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ ہم ریسٹ ہاؤس سے باہر نکلے تو سامنے ایک رتھ کھڑا نظر آیا۔ جونہی ہم اس میں بیٹھے تو رتھ تیز رفتاری سے نامعلوم منزل کی جانب رواں ہو گیا۔

آدھ گھنٹہ بعد رتھ ایک خوبصورت عمارت کے سامنے رک گیا۔ وہاں سینکڑوں طالب علم ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہم ایک کمرے میں پہنچے جو نقشوں اور چارٹوں سے سجا ہوا تھا۔ طالب علموں کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اگلی قطار کی ایک کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے میرے مددگار نے مجھ سے بیٹھنے کے لیے کہا۔

میرے کرسی پر بیٹھتے ہی بہت سے طالب علم کمرے میں داخل ہوئے اور اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ آنے والے طالب علم مختلف ممالک سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں منگول، چینی، وسط ایشیائی، عربی، ایرانی اور یونانی نوجوان نظر آرہے تھے۔

اچانک ایک دراز قد شخص جس نے بھورے رنگ کا گاؤن پہنا ہوا تھا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا ناک نقشہ تیکھا اور چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ عمر میں وہ پچاس کے قریب لگ رہا تھا۔ اس کی کھلی کھلی آنکھوں سے چمک باہر نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یا یوں کہیے کہ اچھی صحت کی تمام نشانیاں ظاہر تھیں۔ مجھے احساس ہوا کہ شاید میں اسے کہیں ملا ہوں لیکن میں اسے پہچان نہیں سکا۔

اس نے خوش دلانہ انداز میں کہا: ''یہاں آنے کا شکریہ۔ امید ہے سفر آرام دہ رہا ہو گا۔''

''جی ہاں! سفر آرام دہ تھا اور یہاں آنے میں تقریباً تیس منٹ لگے۔''

''چلیں اس بہانے تم نے اس ودیا بھون کی سیر بھی کر لی۔''

''تمہارا چہرہ جانا پہچانا لگ رہا ہے؟''

''جیون اک لمبا سفر ہے پیارے۔ جیون راہوں میں کوئی کہاں ملا اور کہاں کھو گیا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ سنسار میں ملنے اور بچھڑنے کی روایت بہت پرانی ہے۔ ہم لوگ اپنے کرموں سے اپنے چاہنے والوں کو کھو دیتے ہیں اور کھونے کے بعد دیر تک اُن کی تلاش کرتے رہتے ہیں۔'' میں حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''میرا نام وشنو گپتا ہے لیکن لوگ مجھے کوتلیہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ میں کچھ عرصہ قدیم ہندوستان کے حکمران پدم نندا کا وزیر رہا۔ میں موریا

سلطنت کا بھی وزیر با تدبر رہا ہوں۔ پدم نندا کے دور میں محلاتی سازشوں، حسد اور جلن کی وجہ سے میں اپنا مقام کھو بیٹھا۔ بحیثیت وزیر میں ایک طاقت ور شخص تھا لیکن مجھے وزارت سے مستعفی ہونا پڑا اور جان بچانے کے لیے دور دراز کے مقامات کی طرف بھاگنا پڑا۔ اس کشمکش کے دوران مجھے احساس ہوا کہ خوشی دولت، راحت، دوستی، صحت یا مایا کی مرہون منت نہیں ہے بلکہ یہ لوگوں کے سماجی تعلقات کی بناء پر وجود میں آتی ہے۔"

حیراں حیراں ہو کر میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کس گورکھ دھندے میں پھنس گیا ہوں۔

وہ کہنے لگا۔ "جیون میں پریم اور چاہت کی موجودگی دیو مالائی داستانوں کی طرح سراب معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسانوں میں پیار کرنے اور کروانے کی صلاحیت موجود ہے۔"

میں نے سوال کیا۔ "پیار! پیار کیا شے ہے؟ لوگ کسی سے تو پیار میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور کسی سے اپنے پریمیوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ کبھی تو وہ ایک دوسرے کے دیوانے ہوتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔ پیار کے بارے ہمارے رویے غلط ہیں۔ یہ تو صرف درد دل اور تکلیف

دیتا ہے۔''

''خبطی ہونا بہت آسان ہے لیکن پریم راہوں کے بارے غلط فہمی میں مبتلا ہونا ایک بہت بڑی غلطی ہوگی۔''

''ایسا کیوں ہے؟''

''زندگی میں حقیقی دولت وہ پریم ہے جو تم لوگوں کو دیتے ہو۔ دوسری دنیا کے سفر میں اس پریم ہی کو تم زادراہ کے طور پر لے جاؤ گے۔ وہ پیار جو تم نے دوسروں کو دیا ایک خدائی عمل ہے۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے کٹھنائیوں کا سامنا مردانگی سے کیا۔ مجھے ایسا کوئی شخص نہیں ملا جس کی زندگی پریم سے خالی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ پریم زندگی کا سب سے انوکھا تحفہ ہے۔ یہ جیون میں آرزو جگاتا ہے اور لوگوں کو جینے کی آس دیتا ہے۔''

''کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔'' میں نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟''

''ہم کو سکھایا جاتا ہے کہ کسی روز ہماری ملاقات کسی ایسے شخص سے ہوگی جس کو دیکھتے ہی ہم اس کے پیار میں گرفتار ہو جائیں گے لیکن ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا ہے۔ اور اگر ایسا ہو بھی جائے تو یہ پیار دیرپا نہیں ہوتا۔''

''اوہ۔۔۔۔ میں سمجھا۔ آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔ تمہارے خیال میں پیار کرنا ایک رومانوی سراب ہے۔''

''میرے خیال میں۔۔۔۔''

''ذرا رکیے!'' اس نے کہا۔'' پیار کوئی جال نہیں ہے جس میں ہم پھنس جائیں گے۔'' وہ مسکرانے لگا۔ پھر کہنے لگا: ''درحقیقت پیار کو ہم تخلیق کرتے ہیں اور ہم سب میں اسے تخلیق کرنے کی اہلیت موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ ڈرتے ہیں کہ وہ پیار کے جال میں نہ پھنس جائیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ سرراہ گزرتے ہوئے وہ کسی سے ٹکرائیں گے اور وہ انہیں پیار میں جکڑ لے گا۔ یوں وہ دردِ دل کا شکار ہو جائیں گے مگر پیار کا یہ تصور درست نہیں ہے۔''

''تو پھر حقیقت کیا ہے؟''

''جسمانی کشش اور پیار میں فرق ہے۔ پیار جسمانی کشش کے نتیجے میں جنم لے سکتا ہے لیکن سچا پیار ایک مختلف کیفیت کا نام ہے۔ اسے پانے کے لیے اپنے محبوب کو سمجھنا پڑتا ہے اور اس کا چارہ ساز اور غم گسار بننا پڑتا ہے۔ اس کی بھلائی کے لیے بھی فکر مند بھی ہونا پڑتا ہے۔

''جیسے؟''

''کیا پھلوں کے رس کو بنا چکھے کوئی بتا سکتا ہے کہ رس لذیذ ہے یا بدمزہ؟''

''رس کو چکھے بغیر نہیں بتایا جا سکتا آیا وہ اچھا ہے یا برا؟''

''اسے چکھنا ہوگا یہ جاننے کے لیے کہ رس کیسا ہے؟ اس خیال سے متفق ہو؟''

''جی ہاں۔''

''لوگوں کو سمجھنے کے لیے بھی ایسا ہی کچھ ہے۔'' اس نے صفائی پیش کی۔ ''کسی کے ظاہر سے اس کے باطن کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ کسی سے دل لگی کرنے کے لیے اس کی اندرونی شخصیت کو سمجھنا ہوتا ہے تاکہ اس کی روح کے جوہر کو پہچانا جا سکے۔ ہر بات آنکھوں سے نہیں دیکھی جا سکتی۔ پیار کے انداز کو صرف دل ہی سمجھتا ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ دیرپا تعلقات اتفاقیہ طور پر وجود میں نہیں آتے نہ ہی ہر بات میں قسمت کا عمل دخل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پریم کی بھی پرورش کرنا پڑتی ہے۔''

''کیسے؟''

''بچپن میں میری ماں نے مجھے پیار کے بارے ایک سنہری اصول بتایا تھا۔ اس کا کہنا تھا: ''یہ بہت آسان بات ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ سے پیار کریں تو آپ کی شخصیت میں بھی دوسروں کی بھلائی کا مادہ ہونا چاہیے۔ ہم سب میں پیار کرنے' کروانے اور پیار بھرے تعلقات تخلیق کرنے کی اہلیت موجود ہے۔ اس کے باوجود لوگ پیار کے بغیر زندگی گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''ایسا کیسے کہا جا سکتا ہے؟ لوگ پیار سے خالی جیون کو کیوں

چنیں گے؟''

پھر اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔'' کچھ لوگ پیار نہیں کرنا چاہتے۔ وہ اس درد کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتے جو علیحدگی یا جدائی کی صورت میں انہیں جھیلنا پڑ سکتا ہے۔''

اس کی باتیں سن کر میں بے چینی محسوس کرنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے دماغ کو پڑھ رہا ہے۔

'' پیارے میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ پیار اور پیار بھرے تعلقات ہمارے اردگرد موجود ہیں لیکن انہیں پانے کے لیے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔''

اس نے میری توجہ قریب ہی بینچ پر بیٹھے ہوئے ایک لڑکے اور لڑکی کی طرف دلائی اور کہنے لگا: '' یہ دونوں ایک دوسرے سے ناراض معلوم ہو رہے ہیں! اصل بات یہ ہے کہ انہیں پیار کا احساس ہی نہیں ہے۔ یہ لوگ پریم گیت کو بھول کر پندار کے حصار میں پھنسے ہوئے ہیں۔ مگر زندگی میں چننے کے لیے بہت کچھ موجود ہے۔ جیسے معاف کرنا بڑی بات ہے یہ ایک خدائی عمل ہے لیکن ایسے کرموں کو چننا پڑتا ہے۔ ''

''کس طرح؟''

''پیارے قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک شخص کی خواب میں کسی فرشتے سے ملاقات ہوئی۔ فرشتے نے اسے بتایا کہ اس کے جیون میں بہت اہم واقعات پیش آنے والے ہیں یعنی اسے بہت مالدار ہونے کا موقع ملے گا۔ عزت اور بلند پایہ مقام ملے گا اور وہ ایک خوبصورت دوشیزہ سے شادی کرے گا۔

وہ شخص عمر بھر ان چمتکاروں کا انتظار کرتا رہا مگر کچھ بھی تو نہ ہوا اور ایک دن وہ مر گیا۔ مایوسی کی حالت میں جب وہ آسمانوں پر پہنچا تو اسے وہ فرشتہ نظر آیا جس نے اسے اچھی اچھی باتیں بتائی تھیں۔ اس نے اسے جا کر پکڑا اور اس سے کہنے لگا تم نے مجھ سے بہت کچھ کہا تھا اور میں زندگی بھر ان انوکھے واقعات کے ہونے کا انتظار کرتا رہا لیکن کچھ بھی تو نہ ہوا۔

فرشتہ کہنے لگا میں نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ ہاں میں نے یہ کہا تھا کہ تمہاری زندگی میں اہم چیزیں حاصل کرنے کے مواقع آئیں گے مگر تم نے خود ہی ان مواقعوں کو گنوا دیا۔

اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیسے مواقع؟''

فرشتہ کہنے لگا یاد کرو۔تم نے ایک دفعہ سوچا تھا کہ کسی کاروبار میں قسمت آزمائی کی جائے لیکن ناکامی کے خوف سے تم نے وہ کاروبار نہیں کیا۔اور فطرت نے اس کاروبار کا خیال بہت دنوں تک کسی اور کے من میں نہیں آنے دیا۔کافی انتظار کے بعد اس خیال کو ایک دوسرے شخص کے من میں ڈالا گیا اور اس نے بلا جھجک اس پر عمل کیا اور وہ شخص ایک کامیاب زندگی کا مالک بن گیا!

فرشتے نے اسے مزید یاد دلایا: "تمہارے شہر میں زلزلہ آیا تھا۔ عمارتیں اور مکانات منہدم ہو گئے تھے اور سینکڑوں لوگ ملبے کے نیچے دب گئے تھے۔موقع تھا کہ تم ان مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرتے اور ملبے تلے دبے ہوئے لوگوں کی زندگی بچاتے مگر تم رہزنوں اور لیٹروں کے خوف سے گھر سے باہر نہیں نکلے۔"

اس کے چہرے پر ندامت کے آثار ابھرنا شروع ہو چکے تھے۔

فرشتہ کہنے لگا: تمہیں موقع دیا گیا تھا کہ تم مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرتے اور ایک بہادر آدمی کی طرح میدان میں اترتے مگر افسوس تم نے اچھے کرم کرنے کا یہ موقع بھی گنوا دیا۔فرشتے نے اسے مزید یاد دلایا کہ کالے بالوں والی ایک حسین دوشیزہ اس کے پیار کی منتظر تھی مگر اس خوف سے کہ کہیں وہ پیار

ٹھکرا نہ دے تم نے اسے اپنی پسند سے آگاہ نہیں کیا۔ جب کہ وہ تمہاری بیوی بن سکتی تھی اور اس کے بطن سے تمہارے پیارے پیارے بچے پیدا ہوتے۔ اس کی قربت سے تمہیں چین اور خوشی نصیب ہوتی۔ وہ خاتون کئی سال تمہارا انتظار کرتی رہی مگر خوف کی وجہ سے تم پیار کے اظہار کی جرات نہ کر سکے۔

''خوف'' میں نے سوال کیا۔

''جی ہاں۔ ہمارا خوف ہمیں لوگوں سے راہ و رسم بڑھانے سے روک دیتا ہے۔ اور ہم اپنے احساسات کی ترجمانی کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ خوف اور شرمندگی اٹھانے کے ڈر سے سہمے سہمے رہتے ہیں۔ اور تکلیف اور درد کے خوف سے دوسروں کے ساتھ پیار کرنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔''

اس کی باتیں سننے کے بعد مجھے بھی اپنی بیوقوفیاں یاد آنے لگیں۔ میں نے بھی خوف کی بناء پر اپنے دوستوں کے پیار کو رد کیا تھا اور کئی ایک من پسند دوشیزاؤں کی چاہت کو ٹھکرایا تھا۔

وہ کہنے لگا۔ ''یاد رکھو پریم کے بغیر دنیا بہت بے رنگ اور سونی سونی نظر آئے گی لیکن پیار کی موجودگی آپ کے جیون کو راحت دیتی ہے۔ سنسکرت کے

مشہور شاعر اور رشی ویاس جی نے کہا تھا: ''ایک دنیا بزدلوں کی ہے اور دوسری جیالوں کی ہے۔ ان کے درمیان فرق پیار کا ہے۔ پیار زندگی کو نمو دیتا ہے اور جینے کی آرزو جگاتا ہے۔ اگر کوئی پیار کے اسرار کو سمجھ جائے تو اس کی زندگی جمود کی بجائے انقلاب کی جانب رواں ہو جائے گی۔''

''وہ کیسے؟''

مسکراتے ہوئے کوتلیہ نے کاغذ کا ایک ٹکڑا میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کاغذ پر چند لوگوں کے نام اور پتے تحریر تھے۔ میں نے اسے پلٹ کر دیکھا اس امید میں کہ شاید وہاں کچھ ہدایات درج ہوں لیکن کاغذ دوسری جانب بالکل کورا تھا۔

جیسے ہی میں نے سر گھما کر ادھر ادھر دیکھا کمرہ خالی تھا۔ میں نے کمرے میں چہل قدمی کی لیکن کوئی ذی حس نہ دکھائی دیا۔ کچھ دیر تو میں نے انتظار کیا اس امید پر کہ شاید یہ لوگ لوٹ آئیں مگر وہاں مکمل سناٹا تھا۔ جونہی میں کمرے سے باہر نکلنے لگا تو میرا سر دیوار سے ٹکرا گیا۔ چوٹ اتنی شدید تھی کہ مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

''میں کہاں ہوں؟''

''جولیاں کے کھنڈروں میں۔''

''تم کون ہو؟''

''چوکیدار۔''

آہستہ آہستہ مجھے ہوش آنے لگا۔ میں ایک پہاڑی چوٹی پر موجود تھا۔ وہاں قدیم زمانے کی ایک عمارت کے کھنڈر پھیلے ہوئے تھے۔ میں اس ویرانے میں لیٹا ہوا تھا اور میرے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔

''انوکھے واقعات میں فطرت کا پیغام چھپا ہوتا ہے'' کسی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ میں نے مڑ کر دیکھا مگر وہاں چوکیدار کے علاوہ کوئی بھی تو نہ تھا۔

جونہی میں باہر جانے کے لیے کھڑا ہوا تو کاغذ کا ایک ٹکڑا نیچے گرا۔ میں نے اسے اٹھایا۔ یہ وہی کاغذ تھا جو تلیہ نے میرے ہاتھ میں تھمایا تھا۔ اس پر کچھ نام اور پتے تحریر تھے۔ ''کیا رات کو جو کچھ ہوا وہ حقیقت تھا؟'' اس سوچ کو لیے ہوئے میں اپنے دماغ کی تہوں کو ٹٹول رہا تھا۔

علاج کے لیے گلابوں کا نسخہ

میری عمر سولہ سال تھی اور یہ اٹھتی ہوئی جوانی کے بے چین دن تھے۔ ہم گرمیوں کے لمبے دن تیراکی، سیر اور کتابیں پڑھتے ہوئے گزارتے تھے۔ دوپہر کو درختوں کے تلے بیٹھ کر تصور جاناں کئے ہوئے نیلے آسماں پر اپنے محبوب کا چہرہ تلاش کیا کرتے تھے اور شامیں چوپال میں چائے پیتے اور گپیں ہانکتے ہوئے گزرتی تھیں۔

اس دوران کچھ اہم واقعات رونما ہوئے۔ جن میں قصبہ کے جنرل اسٹور میں میری ملازمت کا ہونا بھی شامل تھا۔ ملازمت سے انکار کے لیے مجھے کوئی بھی قائل نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ مجھے کام کرنا پسند تھا اور میرے شعور میں بچپن سے یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ کام عبادت ہے۔ ملازمت کے پہلے دن میں نے فضلو یعنی اسٹور کے مالک کا شکریہ سر جھکا کر ادا کیا گو مجھے سر جھکاتے ہوئے

کافی شرم آ رہی تھی۔

فضلو کو اکثر لوگ فضلو چچا کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ پستہ قد اور فربہ اندام جسم کا مالک تھا اور ہمیشہ مکینک کی نیلے رنگ کی یونیفارم پہنے رہتا تھا۔ اس کی بڑی بڑی مونچھیں' کالا رنگ اور گالوں سے گردن کی طرف پھیلا ہوا زخم کا نشان اس کی شناخت کے لیے کافی تھے۔ میں اس کی بدصورتی کے بارے اکثر غور کیا کرتا اور سوچا کرتا کہ اس کے پچھلے جنم میں وہ کون سا پاپ تھا جس کی سزا اسے اب تک مل رہی تھی۔

موسم بہار کے ایک خوشگوار دن میں اور فضلو چچا اسٹور میں اکیلے بیٹھے ہوئے تھے۔ اتفاق سے اسٹور میں کوئی بھی گاہک موجود نہیں تھا۔ فضلو چچا نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے چار بج رہے تھے۔ اسٹور کے سامنے واقع ڈاکٹر پرویز کی کلینک کھلی ہوئی تھی۔ فضلو چچا کہنے لگے۔ ''میں ڈاکٹر سے ملنے جا رہا ہوں اور ہو سکتا ہے مجھے آنے میں دیر ہو جائے۔ مگر اس دوران تم پھولوں کا گلدستہ پروین کے گھر پہنچا آؤ کسی گاہک نے یہ کام کرنے کے لیے کہا ہے۔''

کچھ ہی دیر بعد میں ہاتھ میں گلدستہ لیے ہوئے پروین کے گھر کی جانب جا رہا تھا۔

پروین ہمارے اسکول کے استاد فتح محمد کی بیٹی تھی۔ یہ خوب صورت دوشیزہ نیک خیالات کی مالک تھی اور ایک اچھی گلوکارہ بھی تھی۔ وہ قصبے کے سماجی میل میلاپ کے دوران اکثر گایا کرتی تھی۔

پروین کے چچا کا بیٹا رستم شہر میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ مگر پروین اور رستم اپنے اپنے من میں پندار کے صنم کدوں میں مقید تھے۔ پروین رستم کو چاہتی تو تھی مگر وہ رستم کے اشاروں کا جواب واضح طور پر نہ دے سکی۔ رستم کو یہ بات نہ بھائی۔ یوں رستم اس سے ناراض ہو گیا۔ دونوں یہ نہ سمجھ سکے کہ وہ کن منزلوں پر کھڑے ہوئے تھے۔ لاابالی رویوں اور پندار کے گہرے حصار نے انہیں دھیرے دھیرے ایک دوسرے سے دور کر دیا۔

کالج میں رستم کی ایک ہم جولی مینا تھی۔ مینا آزاد خیال، چنچل اور کشادہ دل کی مالکہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اپنے تعلقات کو کیسے قائم رکھا جائے اور انہیں کس طرح پروان چڑھایا جائے۔ آہستہ آہستہ رستم اور مینا ایک دوسرے کے پیار میں کھو گئے اور تعلیم ختم ہوتے ہی دونوں نے شادی کر لی۔

قصبہ میں ان کی شادی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ پروین کو

بہت دکھ ہوا۔ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ اس کے اور رستم کے درمیان فاصلے اتنے بڑھ چکے تھے۔ پروین نے اس دکھ کو برداشت کرنے کی کوشش کی۔ مگر اداسی کے گہرے جال نے اسے گھیر لیا اور وہ اپنے گھر میں بند ہو کر رہ گئی۔ اس نے لوگوں سے ملنا جلنا بند کر دیا۔ اس کی صحت روز بروز گرنے لگی اور وہ درد اور غم کی چلتی پھرتی تصویر بن کر رہ گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ دل کو جب تکلیف پہنچتی ہے تو یہ سوچ لینا کافی نہیں ہوتا کہ ہم اپنے غم کو برداشت کر لیں گے۔ اور اگلے روز جب سو کر اٹھیں گے تو سب کچھ پہلے ہی کی طرح ہوگا۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ ہر کوئی پیار کا متمنی ہے۔ کھوئے ہوئے پیار کے غم کو برداشت کرنے میں وقت لگتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ غصے اور درد کو بھولنا آسان نہیں ہوتا۔

دن اور مہینے دھیرے دھیرے گزرتے گئے لیکن پروین اپنے دکھ کو نہ بھول پائی۔ وہ گھر میں بیٹھی بیٹھی خیالوں میں کھوئی رہتی تھی۔

وہ اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی کہ اچانک گھر کے دروازے پر دستک سنائی دی۔ جونہی اس نے دروازہ کھولا تو میرے ہاتھوں میں پھولوں کا گلدستہ اس کا منتظر تھا!

''یہاں کیا کر رہے ہو؟'' وہ کہنے لگی۔

''سورج کی روشنی کا مزہ لے رہا ہوں۔''

''آج کل کام کیا کرتے ہو؟''

''چچا فضلو کی دوکان پر نوکری۔''

''خوش تو ہو نا؟''

''جی جاں۔''

''مذاق تو نہیں کر رہے؟''

''ان باتوں کو چھوڑو بی بی! میں تمہارے لیے پھولوں کا گلدستہ لایا ہوں!!''

''کہیں جھوٹ تو نہیں بھول رہے۔ مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔ میرے لیے

یہ تحفہ کس نے بھیجا ہے؟''

''بھیجنے والا کون ہے مجھے معلوم نہیں؟''

پھولوں کی سندرتا نے اس کی اداسی کو دور کر دیا تھا۔خوشی سے اس کا چہرہ دمک اٹھا۔اس نے پھولوں کو چومنا شروع کر دیا۔

اسے اس حال میں دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ ناامیدی اور مایوسی کے دور میں محبت ہی ہماری روح کو سہارا دیتی ہے اور درد کو برداشت کے قابل بناتی ہے۔

کئی ہفتوں تک پھولوں کا گلدستہ پروین کے گھر جاتا رہا۔

پھولوں کے اس تحفے نے پروین پر حیران کن اثر ڈالا۔پھول اس کے لیے بابرکت ثابت ہوئے۔وہ دھیرے دھیرے اداسی سے باہر نکل آئی اور خوش وخرم رہنے لگی۔اس نے سماجی سرگرمیوں میں شامل ہونا شروع کر دیا۔

پھولوں کی اس انوکھی طاقت کے احساس نے میرے دل میں یہ آرزو

جگائی کہ جانا جائے کہ پھول بھیجنے والا کون ہے؟ میں نے فضلو چچا سے کئی بار پوچھا کہ پھول بھیجنے والے کا نام بتائیں لیکن وہ ہمیشہ اس بات کو ٹال دیتے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں دوسروں کے معاملات میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے۔

بہرام بھی اسی قصبہ کا رہنے والا تھا اور قانون کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد شہر میں وکالت کر رہا تھا۔ ایک صبح بہرام اپنے کھیتوں میں کھڑا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک دوشیزہ آبادی کی جانب جا رہی ہے۔ اچانک وہ رکی اور سورج کی دھوپ میں خاموشی سے بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ اور بال روشنی میں چمک رہے تھے۔ گو موسم سرد نہیں تھا۔ مگر اسے دھوپ میں بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا۔ ہرے ہرے پودوں کے درمیان اس کا سرخ سویٹر چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ہاتھ میں آئینہ لیے وہ اپنے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔

بہرام کہنے لگا۔ ''یہ دوشیزہ اپنا وقت ضائع کر رہی ہے۔ وہ حسین ہے اور اسے آئینہ دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

مگر دوشیزہ اپنی خوبصورتی کو ذہن میں لیے خوابوں کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ شاید وہ جاننا چاہتی تھی کہ زندگی میں پیش آتی ہوئی للکار کو کیسے جیتا جاتا ہے۔ انہی خیالوں میں گم وہ دھیرے دھیرے قصبہ کی جانب چل دی۔

بہرام نے نوکر سے پوچھا۔ ''یہ دوشیزہ کون ہے؟''

''فتو کی بیٹی ہے اور ایک نیک دل خاتون ہے۔''

''اچھا اب میں سمجھا۔''

اسی شام بہرام پروین سے ملا اور کہنے لگا۔ ''کیا میں تمہیں پسند ہوں؟''

پروین کہنے لگی: ''تم بھی تو بتاؤ کیا میں تمہیں پسند ہوں؟''

''تم مجھے اچھی لگتی ہو!!''

''لیکن تم نے پہلے تو کبھی اپنے دل کی بات نہیں بتائی!''

''چلو بھئی دیر آید درست آید۔'' دونوں ہنسنے لگے۔

کچھ دنوں بعد پروین اور بہرام کی شادی ہو گئی۔

یہ کہانی میرے لاشعور میں جا کر چھپ گئی۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد مجھے راولپنڈی میں ملازمت مل گئی اور میں وہاں رہنے لگا۔

چھٹیاں گزارنے میں اپنے قصبہ میں آیا تو فضلو چچا سے ملنے ان کے اسٹور گیا۔ انہوں نے میرا سواگت بہت گرم جوشی سے کیا۔ ہم ادھر ادھر کی باتیں ہانکنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ کہنے لگا میاں تم ذرا اسٹور میں بیٹھو میں ضروری کام سے ہو آؤں۔

وہاں بیٹھے بیٹھے میں کاؤنٹر پر پڑے ہوئے رجسٹر کو دیکھنے میں لگ گیا۔ اس رجسٹر میں گاہکوں کے احکامات لکھے جاتے تھے۔ اچانک ایک تحریر نے مجھے سکتے میں ڈال دیا۔ لکھا ہوا تھا:

''ایک درجن گلاب کا گلدستہ پروین کے لیے روزانہ ایک ماہ تک ۔۔ بینا''

اب گلدستہ بھیجنے والے کا راز کھل چکا تھا۔ شہر کی لڑکی کی ذہانت نے پروین کو مکمل ہیرو بننے سے روک دیا تھا۔

سب کچھ گڑیاؤں کا کیا دھرا ہے؟

''نواب دوگل کی کرلا نامی جائیداد کو باغ پتی سیٹھ نے خرید لیا۔''

اس غیر معمولی خبر نے سب کو حیران کر دیا تھا۔ جائیداد کے مکینوں کو یقین تھا کہ جائیداد کی فروخت سرے سے ہوئی ہی نہیں۔ نواب دوگل کی بہن کا کہنا تھا کہ نواب کو فروخت کے کاغذات پر دستخط کرنے سے پہلے جائیداد کے مکینوں کی اجازت لینی چاہیے تھی۔ بہر حال کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ نواب کہاں ہے؟

باغ پتی سیٹھ نے جائیداد کے مکینوں سے جائیداد کو خالی کرنے کے لیے کہا۔ ان لوگوں کے انکار پر انہوں نے عدالت میں دعویٰ داخل کر دیا اور عدالت سے درخواست کی کہ انہیں جائیداد کا حقیقی مالک قرار دے دیا جائے اور وہاں پر رہنے والوں سے جائیداد کا قبضہ دلایا جائے۔ قانونی دستاویزات کی موجودگی میں

جائیداد کے مکینوں کے پاس دفاع کا کوئی راستہ نہ تھا۔ چنانچہ عدالت نے باغ پتی صاحب کے حق میں دعویٰ کا فیصلہ کر دیا اور وہاں رہنے والوں کو اسے خالی کرنے کا حکم دیا۔ یہ لوگ اس حکم سے مطمئن نہ تھے لیکن حکم حاکم کی موجودگی میں انہیں جائیداد باغ پتی سیٹھ کے حوالہ کرنا پڑی۔

میں چھٹیاں گزارنے آریانگر آیا ہوا تھا۔ وہاں پر ہی کسی نے مجھے یہ خبر سنائی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہوا؟ لیکن میرے سوال کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ کالج کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں ایک انشورنس کمپنی میں ملازم ہو گیا۔ ایک روز صبح میرے افسر نے مجھے بلایا اور میرا تعارف ایک نوجوان سے یہ کہتے ہوئے کرایا کہ ہمارے نئے ساتھی کا نام باغ پتی ثانی ہے۔ اسے ہمارے ادارہ میں ملازمت مل گئی تھی۔ تربیت حاصل کرنے کے لیے اسے میرے ساتھ لگا دیا گیا تھا۔''

میں باغ پتی ثانی کو اپنے ساتھ لے آیا اور اسے اپنے کاروبار کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ منڈی میں آج کل کون سے کاروباری اصول چل رہے ہیں اور ان پر روشنی ڈالی۔

تربیت کے دوران اس کا زیادہ تر وقت میرے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ دھیرے دھیرے ہم ایک دوسرے کے اچھے شناسا بن گئے۔ ایک دن دوپہر کے کھانے کے دوران میں نے اس سے پوچھا: ''کیا تم لوگ کرلا جائیداد میں رہ رہے ہو؟''

''جی ہاں!''

''نواب دوگل نے اس جائیداد کو کیوں فروخت کیا؟''

''مجھے تو معلوم نہیں لیکن اگر تم جاننا چاہتے ہو تو میں اپنے والد سے پوچھ سکتا ہوں! تم ہمارے گھر کیوں نہیں آتے۔۔۔ کیا خیال ہے؟''

''کیوں نہیں۔۔۔۔ مجھے تمہارے گھر آ کر خوشی ہوگی۔''

''یہ ہوئی نا بات! اتوار کو گھر آ جاؤ؟''

''ٹھیک ہے۔''

اتوار کے دن موسم ابر آلود تھا اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جب کبھی

سورج کچھ دیر کے لیے بادلوں کی اوٹ سے باہر نکلتا تو خنکی میں کمی ہو جاتی تھی۔ میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا کرلا بھون جا پہنچا اور دروازے پر نصب گھنٹی بجائی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک نوکر نے کھڑکی کی اوٹ سے کہا: ''تمہارے آنے کا مقصد؟''

''میں نے باغ پتی ثانی سے ملاقات کا وقت لیا ہوا ہے کیا وہ موجود ہیں؟''

''مجھے معلوم کرنے دیجئے!''

''اچھا۔''

جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے عمارت کا اندرونی حصہ صاف نظر آ رہا تھا۔ جائیداد کے مرکز میں تالاب کنارے بچے کھیل رہے تھے۔ نقشہ نگار نے عمارت کو ایک خوبصورت انداز دیا تھا۔ عمارت کی شان وشوکت سے یہ واضح تھا کہ جائیداد کی نگہداشت نفاست اور باریک بینی سے کی جا رہی تھی۔

انتظار کے گزرتے ہوئے لمحوں کے دوران میرے ذہن میں نواب اور اس کے خاندان کی موجودہ صورتحال دوڑ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد نوکر کہنے لگا: ''اندر تشریف لائیں!''

ہم ایک لمبی راہداری سے گزرتے ہوئے عمارت کے مرکزی حصہ میں واقع ایک بیٹھک پر پہنچ گئے۔ بیٹھک کی دیواروں پر کالے رنگ کی ریشم کے پردے لٹک رہے تھے جن پر کشیدہ کاری کی ہوئی تھی۔ پردوں پر سنہری پھول اس طرح چمک رہے تھے جیسے تاریکی میں جلتی ہوئی آگ۔ ان پردوں پر ناچتی ہوئی نچنیائیں کشیدہ کی گئی تھیں ان کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ میں اس کشیدہ کاری کو دیکھنے میں محو تھا کہ اچانک یوں محسوس ہوا جیسے کوئی کہہ رہا ہو "یہاں سے چلے جاؤ۔" میں نے ادھر ادھر دیکھا لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے منفی خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔

پردہ پر کشیدہ کی گئیں نچنیائیں ہر لمحے اپنی جگہ تبدیل کر رہی تھیں۔ درحقیقت یہ دھیمے انداز میں ایک زندہ ناچ تھا۔ فن کا یہ نمونہ انوکھا تھا اور میں ان لوگوں کی ذہانت پر حیران ہو رہا تھا جنہوں نے یہ فن پارہ ترتیب دیا تھا۔ اچانک کوئی کہنے لگا۔ "کیا تم اپنے دوست اور اس کے والد کا حال جاننے کے لیے آئے ہو؟"

جونہی میں نے اپنے دائیں جانب دیکھا تو پردے پر کشیدہ کی گئیں نچنیاؤں میں سے ایک نچنیا میرے سامنے کھڑی ہوئی تھی اور اس کے چہرے پر پراسرار مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

"تم کون ہو؟"

''اس جائیداد کے رکھوالے۔''

''کیا پردے میں کشیدہ کی ہوئیں نچنیائیں یہاں کی رکھوالی ہیں؟''

''جی ہاں! کرلا جائیداد کی بنیاد پانڈو راجاؤں نے رکھی تھی۔ جن پردوں کو تم دیکھ رہے ہو ان پر کی گئی کشیدہ کاری ایک جادو ہے۔ ہزاروں سالوں پہلے اسے پانڈو راجاؤں کی خدمت میں معمور ایک پنڈت نے تخلیق کیا تھا۔ دراصل مشہور پانڈو راجہ ہنس جوئے کو ناپسند کرتا تھا۔ اس نے شاہی پنڈت کو حکم دیا کہ وہ جادو کا ایک ایسا جال پھیلائے جو جواریوں کے حلقہ اثر سے اس جائیداد کو محفوظ رکھ سکے۔ پنڈت کے جادوئی علم نے ہمیں یہاں کا رکھوالا بنا دیا۔ جب کبھی اس جائیداد کا کوئی مالک جواء کھیلنا شروع کرتا ہے تو وہ اپنی جائیداد سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ رستم اور اس کا والد جواء کھیلنے کی وجہ سے اس جائیداد سے ہاتھ دھو بیٹھے؟''

''جی ہاں! پرکھوں کے بنائے ہوئے قوانین کی خلاف ورزی ان کی بدنامی کا سبب بنی۔ ہم نے انہیں کئی دفعہ سمجھایا بھی لیکن وہ باز نہ آئے اور یوں وہ اپنی جائیداد سے ہاتھ دھو بیٹھے۔''

کیا نچنیا کی کہی ہوئی باتیں ٹھیک ہیں؟ میں نے نچنیا کی طرف دیکھا!
وہ اب بھی میرے سامنے کھڑی تھی اور اس کے چہرے پر خوفناک مسکراہٹ دوڑ
رہی تھی۔ میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔

"دوست تم کیسے ہو؟" کچھ ہی دیر بعد باغ پتی ثانی کی آواز سنائی دی۔

میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ وہ سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ مجھ سے
کہنے لگا۔ "ٹھیک تو ہونا؟"

"مزے میں ہوں۔"

"اس پردے کو کیوں گھور رہے ہو؟"

"لگتا ہے ان پردوں میں کوئی عجیب و غریب راز چھپا ہوا ہے۔"

"یہ تو بے جان پردے ہیں۔ سناؤ آج کا دن کیسا گزرا؟"
"آج عجیب و غریب چیزوں سے پالا پڑا ہے۔"

''بہت خوب۔ اچھا تم جاننا چاہتے تھے تا کہ رستم اور اس کے والد نے اپنی جائیداد کو کیوں فروخت کیا؟''

''جی ہاں!''

''کچھ عرصہ پہلے تک میرے والد اسٹاک بروکر تھے؟''

''اچھا۔''

''نواب اور اس کا بیٹا اسٹاک کے کاروبار کے بڑے کھلاڑی تھے۔''

''بہت خوب۔''

''منڈی کے اتار چڑھاؤ کی بناء پر انہیں شدید نقصان ہوا اور اب وہ کنگال ہو چکے ہیں۔''

میں سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔

''وہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر سٹہ کھیل رہے تھے۔ میرے والد نے

انہیں سمجھایا بھی لیکن باپ اور بیٹے نے کسی کی نہیں سنی۔"

''تو یوں انہیں جائیداد فروخت کرنا پڑی؟''

''جی ہاں۔''

''کیا تمہارے والد اب بھی اسٹاک بروکر ہیں؟''

''اس جائیداد کو خریدتے ہی میرے والد نے سٹے کے کاروبار کو چھوڑ دیا تھا۔''

یہ سن کر مجھے ہر شے دھندلی دکھائی دینے لگی۔ کشیدہ کی گئیں نچنیاؤں کے پراسرار کردار کے بارے میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا۔ وہ ہی کرلا جائیداد کی حقیقی مالکائیں تھیں!

''کیا یہ حقیقت ہے یا جادو؟'' میرے اس سوال کا جواب دینے کے لیے وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا!!!

کامیابی کے پوشیدہ راز

کبیر نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ شرمیلا کے کمرے کی بتی ابھی تک جل رہی تھی۔ "شرمیلا" اس نے آواز لگائی۔ "ہمیں کھیل کے میدان پہنچنے میں یقیناً دیر ہو جائے گی۔ جلدی کرو۔"

"صبر کرو۔ میں آ رہی ہوں۔"

وہ کمرے کی بتی بجھا ہی رہا تھا کہ کسی نے باہر کی گھنٹی بجائی۔ "اوہ! ایسا نہ ہو کہ اس وقت کوئی بن بلایا مہمان ٹپک پڑے۔" وہ دروازے کی طرف لپکا۔ باہر موج خان ڈاکیا کھڑا ہوا تھا۔

وہ حیرانی سے چلایا۔ ''موج خان تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''آپ کی چٹھی آئی ہے!''

''میری چٹھی!''

''جی ہاں!''

کبیر حیران تھا کہ اسے چٹھی بھیجنے والا کون ہے؟ اس نے چٹھی کھولی۔ کچھ ہی دنوں پہلے اس نے جس ملازمت کے لیے درخواست دی تھی یہ چٹھی اس سلسلہ میں ایک بالمشافہ گفتگو کے لیے دعوت نامہ تھا۔

''بھئی کیا ہو رہا ہے؟'' شرمیلا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''تمہیں یاد ہوگا میں نے ایک ملازمت کے لیے درخواست دی تھی۔ اس سلسلہ میں مجھے بالمشافہ گفتگو کے لیے بلایا گیا ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔''

''اگر کھیل دیکھنا ہے تو جلدی کرو، ہم پہلے ہی کافی دیر کر چکے ہیں۔ کھیل شروع ہو چکا ہوگا!''

''چلو بھئی۔ میں تیار ہوں۔''

کبیر اپنی بالمشافہ گفتگو کے لیے بلس کمپنی کے دفتر پہنچا۔ باہر کی جانب کھلنے والی راہداری خالی پڑی ہوئی تھی۔ ویرانی کو دیکھ کر اس نے کھانسنا شروع کیا اور پھر انتظار کرنے لگا کہ کوئی ذی حس وہاں آ جائے۔ کچھ دیر بعد الماریوں کے عقب سے ایک عمر رسیدہ سیکریٹری باہر نکلی۔ وہ اسے غضب ناک آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ اسے احساس ہو چکا تھا کہ وہ کوئی پسندیدہ شخص نہیں ہے۔ اس نے اپنا تعارف کرایا اور سیکریٹری کو بتایا کہ وہ بالمشافہ گفتگو کے لیے حاضر ہوا ہے۔ یہ سن کر وہ مسکرائی اور اپنا تعارف کرانے لگی: ''میرا نام اجالا ہے اور میں پچھلے پندرہ سال سے مدیر اعلیٰ کی سیکریٹری ہوں۔'' پھر اس نے کہا: ''آپ تشریف رکھیں میں چائے لے کر آتی ہوں۔''

''شکریہ!''

چند لمحوں بعد وہ چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے باہر آئی اور کہنے لگی:

''مدیرِ اعلیٰ کو آپ کے آنے کی اطلاع دی جا چکی ہے۔ آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔''

کچھ دیر بعد اجالا کی میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے پیغام سنا اور کبیر کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اب وہ مدیرِ اعلیٰ کے سامنے بالمشافہ گفتگو کے لیے بیٹھا ہوا تھا۔ جونہی کبیر نے مدیرِ اعلیٰ کے چہرے کو دیکھا تو وہ حیران رہ گیا۔ اس کے بچپن کا دوست جمشید سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

جمشید کہنے لگا۔ ''کبیر انتظار کے لیے معاف کرنا۔''

''ایسی باتیں چھوڑو بھئی۔''

کبیر نے غیر یقینی کیفیت میں اپنا سر ہلایا اور کہنے لگا۔ ''جمشید تکلفات کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم نے اتنی ترقی کیسے کی؟''

''بھئی صبر کرو۔ سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔''

اسی لمحے اجالا کاغذات ہاتھ میں تھامے کمرے میں داخل ہوئی۔ جمشید نے اسے کچھ ہدایات دیں۔ اجالا کے جانے کے بعد وہ جمشید سے کہنے لگا۔"اس سے پہلے کہ میں بھول جاؤں خیال رہے کہ ہم دوپہر کا کھانا ساتھ کھائیں گے اور آپ جو جاننا چاہتے ہیں وہاں اس کا بھی جواب مل جائے گا۔"

"آپ اپنے کاموں سے نمٹ لیں میں انتظار کیے لیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔"

سڑک پر دوپہر کی ریل پیل تھی۔ کار دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔ جمشید بلا تھکان بولے جا رہا تھا۔ اس نے اپنے خاندانی مسائل کا ذکر کیا اور کہنے لگا: "میرے والدین کی علیحدگی ہو چکی تھی۔ مجھے میری دادی نے پالا۔ میں ہائی اسکول سے فارغ ہونے کے بعد مختلف جگہوں پر ملازمت کرتا رہا۔ پھر میں نے شام کے کالج میں داخلہ لے لیا۔ مجھے اپنے دوستوں پر بہت بھروسہ تھا۔ سوچتا تھا کہ وہ عملی زندگی میں میری مدد کریں گے لیکن انہوں نے میرا ساتھ نہیں دیا۔

"دوستوں کے ان رویوں کو دیکھ کر مجھے بے حد دکھ ہوا اور میں ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ خودکشی کے ارادے سے ادھر ادھر گھومنے لگا۔ اس سرگرانی

کے دوران نکاہت اور کمزوری نے مجھے بے حال کر دیا تھا۔ اور میں ایک ویران مقام پر اسی کیفیت میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ مجھے دھندلا دھندلا یاد ہے کہ اس درخت پر کچھ پرندے بیٹھے ہوئے تھے مگر میں ایسی حالت میں تھا کہ بتا نہیں سکتا آیا جاگ رہا تھا یا سو رہا تھا؟ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پرندے بات چیت کر رہے ہیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ میں ان کی بات چیت کو سمجھ سکتا تھا۔ پرندوں میں سے ایک بولا:

''ہے کوئی جو ہماری باتیں سن رہا ہو اگر ایسا ہے تو ہم اپنی سبھا میں اس کا سواگت کرتے ہیں۔''

کچھ ہی دیر بعد ایک اور پرندہ دکھی انداز میں یوں بولا:

''سنو: ایک بچہ اپنے گھر کی بالکونی پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے باپ نے بچے کو نیچے کودنے کے لیے کہا۔ بچے نے یہ سوچ کر چھلانگ لگا دی کہ باپ اسے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے لے گا۔ مگر باپ اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور بچہ زمین پر آ گرا۔ بچے نے روتے ہوئے اپنے باپ سے کہا۔''ابو آپ نے ایسا کیوں کیا؟ مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔''

باپ نے کہا: ''میرے بچے کامیاب زندگی بسر کرنے کا سنہری اصول یہ ہے کہ بغیر سوچے سمجھے دوسروں کی باتوں پر عمل نہیں کرنا چاہیے۔ لوگ تمہیں اسی طرح کودنے کی دعوت دیں گے جیسے آج میں نے تم سے کہا۔ اور پھر وہ اسی طرح پیچھے ہٹ جائیں گے جیسے میں ہٹ گیا تھا۔ تمہیں نقصان پہنچے گا اور لوگوں کے رویے تمہیں مایوسی کی طرف دھکیل دیں گے۔ دوسروں سے امید رکھنا دکھ لے کر آتا ہے۔ اس لیے اپنی ذات پر بھروسہ رکھو اور کامیابی کے لیے محنت کرو۔ کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اپنی خوشیوں میں دوسروں کو شریک کرو اور کسی کو بھی نقصان مت پہنچاؤ۔ ایمانداری کا شعار اپناؤ اور جو اشیاء آپ کی نہیں انہیں کبھی اپنا نہ سمجھو۔''

•

مجھے ایک دم جھٹکا لگا اور میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ ''بدھی کی یہ باتیں مجھے کیوں نہیں سکھائی گئیں تھیں؟'' اسی دوران ایک اور پرندہ بولا:

''ایک درویش اپنی عبادت اور مراقبانہ زندگی سے اکتا کر شہر کی جانب آنکلا اور ایک ساہوکار کے ہاں ملازمت کرنے لگا۔ اسے غلے کی دلالی کا کام سونپ دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد ساہوکار کی شراکت کے تجزیہ نگاروں نے درویش کی عملداری کا تجزیہ کیا۔ اور وہ اس کی کارکردگی پر حیران رہ گئے۔ وہ اپنے کاروبار میں منافع کما رہا تھا۔ ساہوکار نے درویش کو اپنے پاس بلایا اور کہنے لگا: ''میاں تم اپنے کاروباری فیصلوں میں ہوش سے کام لیتے ہو یا جوش میں بہہ جاتے ہو؟''

درویش کہنے لگا: ''میں عبادات اور ذکر کا بندہ ہوں۔ میرے دل میں خوف اور وسوسہ نہیں ہے۔ میری کامیابی کا راز وسوسوں سے دوری ہے۔ کچھ لوگ دنیا داری کی سمجھ بوجھ رکھتے ہیں لیکن ان کے دل میں خوف بھرا رہتا ہے۔ یہ خوف اعتماد میں کمی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور درون خانہ چھپے ہوئے خوف کی بناء پر لوگوں کو ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔''

ابھی میں ان باتوں کی حکمت سمجھ ہی رہا تھا کہ ایک اور پرندے نے اپنی کتھا شروع کر دی۔ اس کا کہنا تھا:

''کسی جنگل میں ایک فاختہ رہا کرتی تھی۔ ایک روز وہ دور دراز کے مقامات کو دیکھنے کے لیے سفر پر روانہ ہوگئی۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کے گھونسلے پر ایک کوے نے قبضہ کر لیا۔ بہت عرصہ بعد جب فاختہ واپس لوٹی تو اس نے اپنے گھونسلے پر ایک کوے کو قابض پایا۔ اس نے کوے کو گھونسلہ خالی کرنے کے لیے کہا۔ لیکن کوے نے گھونسلہ خالی کرنے سے انکار کر دیا۔ بہت چک چک کے بعد دونوں نے سوچا کہ اس الجھن کو کسی پنچ سے طے کرایا جائے۔ فاختہ کہنے لگی کہ اپنے ہمسائے میں رہنے والی نیک دل بلی کو پنچ چن لینا چاہیے۔ کوا رضامند ہوگیا۔ فاختہ اور کوا اس بلی کے پاس گئے۔ جونہی اس نے دیکھا کہ فاختہ اور کوا اس کے پاس بچاؤ لینے کے لیے آ رہے ہیں تو اس نے ذکر و عبادت کا

سلسلہ شروع کر دیا۔ دونوں پرندے اس کی نیک عادات دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کچھ دیر بعد بلی نے ان سے پوچھا کہ الجھن کیا ہے؟

''دونوں پرندوں نے گھونسلے کے قبضہ کے لیے اپنا اپنا نظریہ پیش کیا۔ بلی نے ان کی بات چیت نہایت اطمینان سے سنی۔ جونہی انہوں نے اپنے دلائل ختم کیے بلی نے انہیں اپنے نزدیک آنے کو کہا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ضعیف اور بوڑھی ہے اور کمزوری کی وجہ سے اونچی آواز میں فیصلہ نہیں سنا سکتی تھی۔ دونوں پرندے بلی کے قریب چلے گئے تھے۔ بلی نے ایک ہی جھٹکے میں دونوں پرندوں کا کام تمام کیا اور ان کا گوشت کھا گئی۔''

کسی نے خوب کہا ہے: ''دھوکے باز اور نوسر بازوں پر کبھی یقین نہیں کرنا چاہیے۔''

یہ باتیں سن کر مجھے اپنے استاد کی کہی ہوئی کچھ باتیں یاد آ گئیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہمارے دوست اور آشنا ہماری کامیابیوں پر خوش نہیں ہوتے۔ خود غرضی، خواہشات اور لالچ ان کے ذہنوں میں منفی خیالات پیدا کر دیتی ہے۔ ان کے کردار بیان کی گئی کہانی میں بلی کے کردار کی طرح ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دوسروں کی خوشی اور کامیابی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ایسے لوگوں کو جب بھی

موقع ملتا ہے وہ دوسروں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

میں ان ہی خیالات کی گرفت میں الجھا ہوا تھا کہ ایک اور پرندے نے اپنی کتھا سنانی شروع کر دی۔ وہ کہنے لگا: ''ایک بادشاہ نے اپنے ولی عہد کو علم جوتش سکھانے کا فیصلہ کیا اور ایک باکمال جوتشی کو دور دراز کے علاقے سے اس مقصد کے لیے بلوایا گیا۔ جوتشی نے بہت محنت سے شہزادے کو تعلیم دی اور کچھ سالوں بعد وہ شہزادے کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوا اور کہنے لگا۔
''بادشاہ سلامت آپ کو مبارک ہو شہزادے نے اپنی تعلیم مکمل کر لی ہے۔''

بادشاہ یہ سن کر بہت خوش ہوا اور کہنے لگا۔ ''ہم شہزادے کے علم کا امتحان لیں گے۔''

جوتشی نے کہا۔ ''جہاں پناہ! جیسے آپ کی مرضی۔''

بادشاہ نے اپنی مٹھی بند کی اور شہزادے سے کہا کہ بتاؤ میری مٹھی میں کیا ہے؟

شہزادے نے حساب لگا کر کہا کہ آپ کی مٹھی میں ایک گول شے ہے

جس کے درمیان میں سوراخ ہے۔

بادشاہ شہزادے کے جواب سے خوش ہوا اور کہنے لگا لیکن اس شے کا نام تو بتاؤ؟ شہزادہ کہنے لگا کہ آپ کی مٹھی میں چکی کا پاٹ ہو سکتا ہے۔ بادشاہ نے غصیلی نظروں سے جوتشی کی طرف دیکھا۔

جوتشی اپنے خیالات میں مگن اعتماد کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ کہنے لگا: ''بادشاہ سلامت میں نے شہزادے کو علم سکھایا ہے اور اس علم نے اسے بتا دیا تھا کہ آپ کی مٹھی میں ایک گول شے ہے جس کے درمیان سوراخ ہے۔ اس بات کی تمیز کرنا کہ مٹھی میں انگوٹھی تو آ سکتی ہے چکی کا پاٹ نہیں عقل کی بات تھی۔ آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ شہزادہ ابھی کمسن ہے اور عمر کے ساتھ ساتھ اس کے تجربے میں اضافہ ہوگا۔ اپنے تجربات کی روشنی میں وہ بہتر اور حکمت آمیز فیصلے کر سکے گا۔ بدھی کے لیے تجربہ نہایت ضروری ہے۔''

یہ سن کر میں ایک دم چلایا: ''مجھے نروان مل گیا؟''

ان کہانیوں نے میری سوچ کو تبدیل کر دیا اور میں آرزوؤں کی دنیا سے نکل کر عملی دنیا میں آ گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ دوسروں پر بھروسہ کرنا کمزوری

کی علامت ہے۔ میری ترقی کا راز محنت اور لگن ہے۔

جونہی کار مہاراجہ کلب کے پورٹیکو میں آ کر رکی۔ وہ گاڑی سے باہر نکلے۔ جمشید نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ تین بجے تک واپس آ جائے۔

مہاراجہ کلب کے کارندے جمشید کو بخوبی جانتے تھے۔ انہوں نے انہیں کھانے کے لیے ایک آرام دہ جگہ پر بٹھایا۔ کھانے کے دوران جمشید نے کہا۔ ''دیکھو دوست مجھے معلوم ہے کہ تمہیں ملازمت کی سخت ضرورت ہے اور ہمارے پاس ایک آسامی بھی خالی ہے۔ مگر تم میرے آشنا اور دوست ہو۔ اس آسامی پر تمہاری تقرری کا مطلب تمہارے درون خانہ نفرت اور حسد کا مادہ پیدا ہونا ہے اور یوں تم مجھے نقصان پہنچانے کے درپے ہو جاؤ گے۔ ہماری دوستی دشمنی میں بدل جائے گی۔ مگر میں ایسا نہیں چاہتا اس لیے میری خواہش ہے کہ تم کسی اور جگہ ملازمت کی کوشش کرو۔''

''تم نے ٹھیک کہا جمشید! ایسا ہی ہو گا جیسا تم چاہو گے۔''

کبیر گھر پہنچا تو شرمیلا اس کی منتظر تھی۔ وہ اپنے خاوند کی کامیابی کے بارے پر اعتماد تھی اور اس کا خیال تھا کہ کبیر کو ملازمت مل چکی ہو گی۔ اپنی بکھری

ہوئی زندگی کو ہم آہنگ کرنے کے لیے اس نے دل ہی دل میں کافی منصوبے بنا لیے تھے۔

شرمیلا کی ان آشاؤں کو بھانپ کر کبیر اور افسردہ ہو گیا۔

شرمیلا نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ مگر اب میں آنے والے کل کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہوں۔''

جانور بھی دانش مند ہوتے ہیں؟

پسینے سے شرابور بلقیس گھر کے اندر داخل ہوئی۔ تیس کے پیٹے یہ خاتون لمبے اور پھولے ہوئے جسم کی مالک تھی۔ اس نے زرد رنگ کی قمیض اور بھورے رنگ کی پتلون پہنی ہوئی تھی۔ جیسے ہی وہ پانی پینے کے لیے رسوئی میں داخل ہوئی ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

بلقیس نے فون اٹھا کر کہا۔ ''ہیلو! کون بول رہا ہے؟''

''میں بابر بول رہا ہوں بلقیس۔ امی کو بلاؤ۔''

''امی تو ابھی گھر پر نہیں ہیں۔ وہ ڈاکٹر سے ملنے گئی ہوئی ہیں۔''

''کیوں؟ خیریت تو ہے نا؟''

''کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''تم نے فون کیوں کیا؟ کیا تم ہفتہ کے روز گھر آ رہے ہو؟ امی جان نے سب کو گھر بلایا ہے۔''

''میں آ رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں امی کو بتا دوں گی۔'' بلقیس نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

بلقیس چوہان خاندان کی فرد تھی۔ چوہان برصغیر کے نامی گرامی لوگ ہیں۔

کچھ دیر بعد گھر کا پچھلا دروازہ کھلا اور بیگم چوہان ٹوپی پہنے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ وہ لمبے قد اور سانولے رنگ کی مالک تھی۔ اس نے ٹوپی کو سر سے اتار کر میز پر رکھ دیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک کالی بلی بھی رسوئی میں داخل ہوئی اور میاؤں میاؤں کرتی ہوئی ادھر ادھر بھاگنے لگی۔

بلقیس سینڈوچ بنا رہی تھی۔ اپنی ماں کو دیکھتے ہی وہ کہنے لگی۔ ''امی بابر کا فون آیا تھا۔ وہ ہفتہ کے روز گھر آ رہا ہے۔''

بیگم چوہان خاموش رہی۔ کچھ دیر بعد وہ بلقیس سے کہنے لگی۔ ''تم کل تک گھر کی صفائی مکمل کرلو۔ اور ہاں بازار سے میری دوائی لانا نہ بھولنا۔''

''بہت اچھا امی۔''

بیگم چوہان جونہی دروازے کی طرف بڑھی تو بلقیس کہنے لگی۔ ''امی ذرا ٹھہریں میں آپ کو یہ بتانا ہی بھول گئی کہ صبح سلیم یہاں آیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اسے نوکری سے نکال دیا گیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اسے آپ کی شکایت پر نکالا گیا ہے۔''

بیگم چوہان کہنے لگی۔ ''اس کا خیال جو بھی ہو اسے بتا دینا کہ میں اس سے بات نہیں کرنا چاہتی۔''

''امی وہ ابھی کم عمر ہے اور یہ اس کی پہلی نوکری ہے۔ اگر آپ اپنی شکایت واپس لے لیں گی تو وہ نوکری پر بحال ہو جائے گا۔''

بیگم چوہان نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔

شام کے سات بج چکے تھے۔ بلقیس کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

اچانک دور سے ایک کار آتی ہوئی نظر آئی۔ گھر کے سامنے پہنچ کر اس کی رفتار دھیمی ہوگئی اور وہ رک گئی۔ اس کا چھوٹا بھائی بابر کار سے باہر نکلا۔

بلقیس نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ ''بابر تم آ گئے۔ میں بہت خوش ہوں۔''

''بلقیس میری بہن تم کیسی ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں۔''

گھر میں داخل ہوتے ہی بابر بیگم چوہان کے کمرے میں داخل ہوا۔

''پیاری امی مجھے ذرا دیر ہوگئی۔ معاف کیجئے گا۔ ہاں میں کہتا چلوں کہ آج آپ کی عمر پچاس سال ہورہی ہے مگر آپ جوان نظر آ رہی ہیں۔''

بیگم چوہان نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہنے لگی۔ ''بابر دیر ہورہی ہے سب لوگ آ چکے ہیں۔ چلو کھانے کے لیے چلیں۔''

کھانے کے کمرے میں بیگم چوہان کے پہنچنے پر سب لوگ باادب اٹھ

کھڑے ہوئے۔بیگم چوہان نے کہا: ''بابر آچکا ہے کھانا شروع کیا جائے۔اسی دوران بلقیس کی چھوٹی بہن صنم کہنے لگی۔ ''بلقیس میز کی سجاوٹ بہت اچھی ہے۔یہ خوبصورت پھول تم نے اکٹھے کیے ہیں؟''

''جی ہاں!''

صنم ایک خوصورت خاتون تھی۔اس کے بال لمبے اور کالے تھے اور اس کی آنکھیں گہرے بھورے رنگ کی تھیں۔اس نے سرخ رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔اس کا خاوند یونس بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھا ہوا تھا۔

کھانے کے دوران بابر نے گفتگو شروع کی اور کہنے لگا۔''ایک سلیم نامی شخص نے مجھے باہر سڑک پر روک لیا۔وہ کون ہے؟ امی وہ آپ سے سخت ناراض معلوم ہوتا ہے۔''

بلقیس کہنے لگی۔''اس کا نام سلیم رانجھا ہے۔اور وہ ہمارے ہی محلے میں رہتا ہے۔اسے نوکری سے نکال دیا گیا ہے۔آج کل وہ سب لوگوں سے ناراض ہے۔''

بابر نے پوچھا۔''کیا امی اسے ناپسند کرتی ہیں؟''

بیگم چوہان خاموش بیٹھی رہی۔ بلقیس نے بھی اس بارے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

"خالہ رومانہ کا کیا حال ہے؟" بلقیس نے بابر سے پوچھا۔

"ان کی حالت کچھ اچھی نہیں ہے۔ خالہ آج کل بیماری کی وجہ سے چل پھر نہیں سکتیں اور انہیں دیکھ بھال کے لیے ہر وقت ایک مددگار کی ضرورت رہتی ہے۔"

بیگم چوہان کہنے لگی۔ "کتنے دکھ کی بات ہے۔"

بابر کہنے لگا۔ "خالہ سخت ناراض ہیں کہ آپ ان سے نہیں ملتیں۔ وہ آپ سے پیار کرتی ہیں۔ آپ ان کی چھوٹی بہن ہیں نا۔"

یہ سن کر بیگم چوہان نے اپنی آنکھیں بند کیں اور کہنے لگی۔ "بابر مجھے معلوم ہے۔ میں آج پچاس سال کی ہو چکی ہوں لیکن تمہاری خالہ کی نظر میں ابھی تک ایک چھوٹی بچی ہوں۔ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ کوئی مجھے آج بھی بچہ سمجھے۔"

بابر ہنسنے لگا۔ "امی آپ اپنی بہن سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہو

جاتی ہیں۔"

بلقیس غور سے اپنی ماں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ ماں بابر سے ناراض ہو چکی تھی۔ انہیں رومانہ کا ذکر پسند نہیں تھا اور نہ ہی انہیں اپنی بہن سے ملنا اچھا لگتا تھا۔

ماحول میں اداسی گھس چکی تھی۔ سب لوگ خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ خاموشی کو توڑتے ہوئے بلقیس نے صنم سے کہا: "تمہارا لباس بہت خوبصورت ہے!"

"بلقیس یہ لباس بہت قیمتی ہے۔ میں نے اسے کچھ دن پہلے ہی میں خریدا ہے۔"

"صنم سب کو معلوم ہے کہ تمہیں مہنگی چیزیں پسند ہیں!"

"سستی چیزیں مجھے پسند نہیں ہیں۔ ہاں یاد آیا مجھے جلد ہی مجھے کچھ اور پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ میں آسٹریلیا جانا چاہتی ہوں۔ بابر کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟"

بابر کہنے لگا۔ "نہ بابا نہ۔ صنم میں تمہاری مالی مدد کوئی بھی نہیں کر سکتا۔"

صنم نے قہقہہ لگایا۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا بابر مجھے تمہاری مدد کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ امی میرا ہمیشہ سے ہی بہت خیال رکھتی ہیں۔" وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں سفا کی نظر آ رہی تھی۔ بلقیس نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ بیگم چوہان کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ وہ صنم سے خوف زدہ تھی؟

"بابر کیا تمہیں سالن کی اور ضرورت ہے؟" بلقیس نے پوچھا۔

"جی نہیں۔"

"یونس کیا تم سب لوگوں کو پھلوں کا رس دینا پسند کرو گے۔" بلقیس نے کہا۔ یونس اٹھا اور اس نے لوگوں کو رس دینا شروع کر دیا۔

بابر کہنے لگا۔ "پھلوں کا رس بہت مزیدار ہے۔"

بیگم چوہان کے چہرے پر پہلی دفعہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور وہ کہنے لگیں۔ "تمہارے والد کو بھی آم کا رس بہت پسند تھا۔"

بلقیس کہنے لگی۔ "یونس کیا تم اختتام ہفتہ جے سنگھ سے ملنا پسند کرو گے۔

وہ اسکول میں آنے والا نیا استاد ہے۔"

بیگم چوہان ناراضگی کے انداز میں بولیں۔" کیا جے سنگھ جے سنگھ لگا رکھی ہے۔ اس کا ذکر مت کرو۔ وہ شخص مجھے پسند نہیں ہے۔ وہ نہ صرف بدصورت ہے بلکہ اس کے منہ سے بدبو بھی آتی ہے۔ وہ میرا مکان کرائے پر لینا چاہتا ہے۔"

اچانک بلقیس کھڑی ہوئی اور کہنے لگی۔"معاف کیجئے گا میں باہر جا رہی ہوں۔"

"بلقیس! ابھی ٹھہرو۔ گھر میں مہمان ہیں۔" بیگم چوہان نے کہا۔

"بہت اچھا امی۔" اور وہ بیٹھ گئی۔

اسی دوران یونس نے آواز لگائی: "کیا کوئی رس پینا پسند کرے گا۔"

سب نے کہا۔"نہیں۔"

یونس کہنے لگا۔" امی جان مکان خالی پڑا ہے اور ہمیں اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ جے سنگھ کو اسکول میں اضافہ کرنے کے لیے مکان کرائے پر دے

میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

بیگم چوہان بولی۔''یونس مجھے فیصلہ کرنے کے لیے تمہاری رائے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ مجھے معلوم ہے تم سب لوگ مجھ سے پیسہ بٹورنا چاہتے ہو لیکن مجھ سے پیار نہیں کرتے۔''

بلقیس کہنے لگی۔''امی جان ایسا مت کہیے۔''

کمرے سے باہر جاتے ہوئے بیگم چوہان نے کہا: ''مجھے خوشامدی باتوں سے نفرت ہے۔ مجھے تنگ مت کرو۔اب میں سونے جارہی ہوں۔''

بیگم چوہان کے باہر جاتے ہی صنم کمرے میں داخل ہوئی اور کہنے لگی۔ ''بہت بوریت ہورہی ہے۔''

بابر نے گھور کر صنم کی طرف دیکھا۔ماحول میں اداسی کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔اس پراگندگی کو دور کرنے کے لیے بلقیس بولی۔''میرے خیال میں سب لوگ چائے پینا پسند کریں گے۔آیئے بیٹھک میں بیٹھ کر چائے پئیں گے۔میں اپنے کام بعد میں کرلوں گی۔''

سب لوگ چائے پینے کے لیے اٹھ گئے۔

صبح کے نو بج رہے تھے۔ گھر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اچانک بیگم چوہان کے کمرے سے ایک چیخ سنائی دی۔ بابر آنکھیں مسلتا ہوا اٹھا۔ بلقیس بیگم چوہان کے کمرے سے باہر نکلی۔ اس کا چہرہ بالکل سفید تھا۔ وہ کہنے لگی۔ "بابر آ ہ امی جان۔ میں ان کے لیے کافی لے کر آئی تھی مگر وہ اپنے بستر پر مردہ پڑی ہیں۔"

بابر فوراً بیگم چوہان کے کمرے میں گیا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی مگر کمرے میں حرارت موجود تھی۔ بیگم چوہان اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھیں اور ان کا ایک ہاتھ ان کے سر کے پیچھے تھا۔ بابر نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ وہ بالکل سرد تھا۔ بستر کے نزدیک چھوٹی میز پر ایک خالی پیالی موجود تھی۔

صنم کہنے لگی۔ "میں ڈاکٹر کو بلا رہی ہوں۔"

کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر پرویز وہاں آ گئے۔ وہ فربہ اندام، گنجے اور چھوٹے قد کے مالک تھے۔ ڈاکٹر پرویز چوہان خاندان کے خاندانی معالج تھے۔ انہوں نے بیگم چوہان کے جسم کا بغور مطالعہ کیا اور میز پر رکھی پیالی کو بھی سونگھا۔ کچھ دیر تو ڈاکٹر پرویز سکتے کے عالم میں کھڑے رہے پھر کہنے لگے۔ "یہ معاملہ سنگین ہے۔

میں پولیس کو اطلاع دے رہا ہوں۔"

"پولیس! بھئی کیوں! آخر معاملہ کیا ہے؟" بابر کہنے لگا۔

"مجھے معلوم نہیں لیکن تمہاری ماں بیمار نہیں تھیں۔ میں نے ان کا طبی معائنہ جمعرات کے دن کیا تھا اور وہ بالکل صحت مند تھیں۔ اچانک ان کی موت کیسے ہوئی۔ دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔ اس گتھی کو سلجھانے کے لیے پولیس کو بلانا پڑے گا۔"

کچھ ہی دیر بعد پولیس پہنچ گئی۔ "صبح بخیر۔ میرا نام انسپکٹر وڑائچ ہے اور میرے ساتھ سارجنٹ جوڑا ہیں۔" انسپکٹر ایک صحت مند شخص تھا۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کی وردی پہنی ہوئی تھی۔ اس نے آتے ہی اپنے ساتھیوں کو تفتیش کرنے کے لیے کہا۔

انسپکٹر کہنے لگا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیگم چوہان کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے۔ اور اس راز کو کھلنے میں کچھ وقت لگے گا۔"

پولیس افسران ابھی تک بیگم چوہان کے کمرے میں ہی موجود تھے۔ اچانک انسپکٹر کو ایک کالی بلی نظر آئی۔ بلی بستر کے سامنے والی دیوار کو اپنے پنجوں

سے کھرچ رہی تھی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے پنجوں کو تیکھا کر رہی ہو۔

بلی کی حرکتوں کو دیکھ کر انسپکٹر کہنے لگا: ''بلی کی حرکتیں پراسرار دکھائی دے رہی ہیں؟''

یہ سن کر سارجنٹ جوڑا دیوار کے پاس گیا۔ اس کے قدموں کی آواز سن کر بلی میاؤں میاؤں کرتی ہوئی بھاگ گئی۔ سارجنٹ نے دیوار کا معائنہ کیا۔ دیوار پر کھرچنے کے نشانات ہر اطراف پھیلے ہوئے تھے مگر ان نشانات میں ایک ترتیب اور سلیقہ نظر آ رہا تھا۔

سارجنٹ کہنے لگا۔ ''واقعی بلی کی ان کھرچنوں میں کوئی راز چھپا ہوا ہے۔''

انسپکٹر کہنے لگا۔ ''کیا فضول بات کر رہے ہو۔''

سارجنٹ جوڑا کہنے لگا: ''گھریلو جانوروں کے بارے ہم کچھ نہیں جانتے۔ یہ جانور بہت بدھی مان ہوتے ہیں۔ اپنے گھر کے ماحول اور واقعات کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر بلیاں گفتگو کر سکتیں تو یہ عجیب و غریب کہانیاں سناتیں۔''

انسپکٹر پوچھنے لگا۔ ''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

میرا دل کہہ رہا ہے کہ ان کھرچنوں میں بلی کی مطالعاتی رپورٹ ہے کیوں کہ وہ ایک پالتو جانور ہے۔

''بھئی اسے کون پڑھے گا۔ کیسی فضول باتیں کر رہے ہو۔''

سارجنٹ کہنے لگا۔ ''میں ایک شخص مجید کو جانتا ہوں۔ وہ اخبار نویس ہے اور پالتو جانوروں بالخصوص بلیوں کے بارے بہت کچھ جانتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ بلیاں گفتگو کر سکتی ہیں اور ارد گرد ہونے والے واقعات کا مشاہدہ بھی کرتی ہیں۔''

انسپکٹر کہنے لگا۔ ''اسے بلاؤ۔''

کچھ دیر بعد مجید شیخ وہاں پہنچ گیا۔ اس نے دیوار کا بغور مطالعہ کیا۔ اچانک اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

بابر نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

وہ کہنے لگا۔ ''اس گھر میں نہایت خوبصورت انداز میں ترتیب دیا ہوا قتل

ہوا ہے۔" بابر غصے سے بھڑ گیا اور کہنے لگا۔" کیا؟ قتل ۔۔ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

مجید شیخ کہنے لگا۔" بلی بیگم چوہان سے بہت محبت کرتی تھی۔ یہاں پر ہونے والے گزرے ہوئے دنوں کے واقعات کا اس نے گہرا مشاہدہ کیا اور انہیں تحریر کر دیا۔ آپ کسی سے کاغذ اور قلم لانے کے لیے کہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ بلی کے تحریر کردہ واقعات کو آپ کے سامنے پیش کر سکوں۔"

مجید شیخ کی گفتگو سن کر سب لوگ سناٹے میں آ گئے۔

کچھ دیر بعد اس نے بلی کی تحریر کردہ مشاہدات کی رپورٹ پیش کی جو کچھ یوں تھی:

سوموار، ۱۵ جون

"سوتی رہی۔"

منگل، ۱۶ جون

''آج دیوار پر چڑھی دوپہر کو پڑوسیوں کے گھر گئی۔ بیگم جنجوعہ سودا سلف لے کر واپس آ رہی تھیں۔ میں جلدی سے اپنے گھر واپس آ گئی''

''گلی میں بچوں اور پریم پنچھیوں کی ریل پیل تھی۔ گرمی کی وجہ سے لوگ باہر کی تازہ ہوا کا لطف اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ گھر واپس آ گئی۔''

بیگم چوہان ڈاکٹر سے ملنے اس کے شفا خانہ گئیں۔ بلقیس نے بابر سے ٹیلی فون پر گفتگو کی۔ ہفتہ کے دن بابر گھر آئے گا۔

بدھ' ۱۷ جون

''سوتی رہی۔''

جمعرات' ۱۸ جون

''سوتی رہی۔''

بیگم چوہان سہ پہر کو ڈاکٹر سے ملنے گئیں۔

جمعہ ۱۹ جون

ہفتہ کے دن آنے والے مہمانوں کے لیے گھر کی صفائی ستھرائی کرنے میں بلقیس مشغول رہی۔

ہفتہ ۲۰ جون

''صبح: سوتی رہی۔''

دوپہر: عقبی لان میں پرندے کو پکڑنے کی کوشش کی۔

شام: تمام مہمان آ گئے۔ بیگم چوہان بہت خوش تھیں۔ ملن اچھا رہا۔

رات: صنم سلیم رانجھا کو گھر بلانا چاہتی تھی۔ وہ بیگم چوہان سے بہت ناراض تھا۔ بیگم چوہان نے سلیم کے مالکان کو شکایت کی تھی۔ صنم کی خواہش تھی کہ سب لوگ اس کی ناراضگی کو جان جائیں!

بیگم چوہان اپنے کمرے سے کھانے پینے کی کوئی شے لینے کے لیے باہر

نکلیں۔ صنم اس لمحے کی منتظر تھی۔ وہ ان کے کمرے میں داخل ہوئی اور نیند آور گولیاں ان کے دودھ میں ملا دیں۔ اور گولیوں کی خالی شیشی کو اس نے بلقیس کے بٹوے میں ڈال دیا۔

اتوار ۲۱ جون

بیگم چوہان انتقال کر گئیں۔

ڈاکٹر تشریف لائے اور انہوں نے پولیس کو بلایا۔

مجید شیخ نے یہ ہفتہ وار روز نامچہ انسپکٹر کے حوالے کر دیا۔

انسپکٹر نے کہا تمام لوگ بیٹھک میں اکٹھے ہو جائیں۔ گھر کے افراد بیٹھک میں اکٹھے ہو گئے۔ انسپکٹر نے بلی کا لکھا ہوا روز نامچہ سب کو سنایا۔ سب لوگ سکتے میں آ گئے۔ صنم کھڑی ہو گئی اس کی آنکھوں میں خوف مترشح تھا۔ وہ کہنے لگی۔ ''آپ لوگ نہیں جانتے بیگم چوہان میری ماں ضرور تھی مگر اس نے ضرورت کے وقت میری کوئی مالی مدد نہیں کی۔ میں بس خوش رہنا چاہتی تھی لیکن میری ماں ایسا ہونے نہیں دیتی تھی۔ اس نے کبھی بھی میری خواہشات کو کوئی

اہمیت نہیں دی۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہیں دی۔

صنم پولیس کار میں بیٹھ کر چلی گئی۔

انسپکٹر وڈ ہاؤس کچھ دیر تو سکتے کے عالم میں رہا پھر وہ بھی اپنی کار کی جانب چل دیا۔ وہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے قبل وہ رکا اور موڑ کر بیگم چوہان کے گھر کی جانب دیکھا۔

"بہت خوب۔" اس نے سارجنٹ جوڑا سے کہا۔ "لوگوں کی باتوں پر کبھی یقین مت کرو۔"

ہمارے افسر کو کیا ہو گیا ہے؟

جونہی سمن اپنے دفتر پہنچا اس نے دیکھا کہ کمپنی کا چیف ایگزیکٹو آفیسر شاداب کبیر وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ میز پر رکھا راکھ دان راکھ سے بھرا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اس کے انتظار میں لگاتار سگریٹ پیتا رہا ہے۔ پریشانی اس کے چہرے سے ظاہر تھی اور وہ فکر مند نظر آ رہا تھا۔

سمن نے شاداب کبیر سے پوچھا: ''جناب آپ کیسے ہیں؟''

''میں تو خیریت سے ہوں تم سناؤ؟''

سمن کہنے لگا۔ ''میں بھی آج کل پریشان ہوں۔ ہماری بکری لگاتار کم

ہو رہی ہے اور فروخت بڑھانے کی حکمت عملی ناکام ہو رہی ہے۔ اس صورت حال کا سامنا کیسے کیا جائے میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا؟''

••

شاداب کبیر کہنے لگا۔ ''سمن کاروباری ادارے اپنے کاروبار کے بارے اچھی اور بری خبر سننے کے عادی ہوتے ہیں۔ حکمت عملی کی ناکامی کی صورت میں کاروباری ادارے اپنی تقابلی برتری رکھنے میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ مشکل حالات کا سامنا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے ساتھیوں کو اپنا چارہ ساز اور غم گسار بنایا جائے۔''

••

سمن کہنے لگا: ''میں حیران ہوں کہ میری حکمت عملیاں کیوں ناکام ہو رہی ہیں؟ مجھے کاروباری دنیا کا خاصا تجربہ ہے اور کاروبار میں برق رفتار کامیابیاں حاصل کرنے میں مجھے کبھی ناکامی کا سامنا نہیں ہوا۔ لیکن آج میں اپنی کوششوں میں ناکام ہوتا ہوا نظر آ رہا ہوں۔ سمجھ میں نہ آنے والی کوئی غلطی ہو رہی ہے؟''

''کیسے پتہ چلائیں کہ ہماری ناکامیوں کی وجوہات کیا ہیں؟''

''میں اس الجھن کی گتھیوں کو سلجھانے میں لگا ہوا ہوں۔''

شاداب کبیر نے سگریٹ کا ایک کش لگایا اور کہنے لگے: ''کیا تم نے نئے اقدامات اٹھانے میں جلدی تو نہیں کی؟ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ ان فیصلوں کو مقاصد حاصل کرنے سے پہلے ہی رد کر دیا گیا ہو۔ ایسے ماحول سے کہیں تمہارے ساتھی مایوس تو نہیں ہو گئے؟''

''ایسا کہنا قبل از وقت ہوگا۔ میں کھوج میں ہوں جلد ہی حقیقت کا پتہ چل جائے گا۔''

''ایک تجربہ کار منتظم کی حیثیت سے تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر تم اپنی ٹیم کے لیے اس کی صلاحیتوں سے کم حدف مقرر کرتے ہو تو اس صورت میں ان کی صلاحیتیں نہیں نکھریں گی۔ اس لیے وہ ہدف رکھو جو لوگوں کے یقین کے مطابق قابل حصول ہوں۔ اپنے ساتھیوں کے ذہنی افق کو پھیلاؤ کیونکہ ذہنی افق کے پھیلاؤ سے ہی کامیابی ممکن ہوتی ہے۔''

''میں صورتحال سے نمٹنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

شاداب کبیر کہنے لگا۔ ''کیا تم نے فلم مندر دیکھی ہے۔''

''نہیں تو۔ میں نے تو اس کا نام بھی نہیں سنا۔''

''بلاشبہ یہ ایک دلچسپ فلم ہے۔ آؤ ہم دونوں اس فلم کو دیکھیں۔ کیا تم آج سہ پہر میرے گھر آ سکتے ہو؟''

''کیوں نہیں۔''

سہ پہر کو ممن شاداب کبیر کی رہائش گاہ پر جا پہنچا۔ اس نے دروازے پر نصب گھنٹی بجائی۔ کچھ ہی لمحوں بعد دروازہ کھلا۔ شاداب کبیر باہر نکلا اور بولا۔ ''اندر آ جاؤ۔ میں تمہارا ہی منتظر تھا۔''

بیٹھک میں پہنچ کر شاداب کبیر نے اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ماحول میں خاموشی تھی۔ شاید وہ کسی کا انتظار کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد نوکر چائے لے آیا اور چائے کی پیالی دونوں کے سامنے رکھ دی۔

چائے پیتے ہوئے شاداب کبیر کہنے لگے۔ ''تو تم فلم دیکھنے کے لیے

تیار ہو۔"

سمن بولا۔ "جی ہاں!"

اس نے ٹیلی ویژن کا بٹن دبایا۔ فلم شروع ہوگئی۔ کیمرہ ایک پہاڑی سلسلہ میں واقع پرانے مندر پر مرکوز تھا۔ پنڈتوں کا ایک گروہ اپنے مہا پنڈت کے ہمراہ اسکرین پر ظاہر ہوا۔ وہ اپنی عبادت کی تیاری کر رہے تھے۔ مہا پنڈت کے پیچھے پیچھے ایک بلی نمودار ہوئی۔ ایک پنڈت نے اسے روک کر پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔ مہا پنڈت نے اسے ایسا کرنے سے روکا اور کہنے لگا: "خدائے بزرگ نے ہمیں محبت جیسی قوت عطا کی ہے۔ صبر، قناعت، پیار کرنا اور پیار بھری دوستیاں کرنے کی دعوت دی ہے۔ ہمیں ان میں سے نہیں ہونا چاہیے جو ان قوتوں پر ایمان نہیں رکھتے۔" مہا پنڈت نے بلی کو رسی سے باندھا اور عبادت شروع کر دی۔

کچھ دیر بعد ایک نیا منظر ابھرا۔ پہلے واقعہ کو دس سال گزر چکے تھے۔ مہا پنڈت اب زندہ نہیں تھا۔ عبادت سے قبل بلی کو رسی سے باندھنے کی رسم ابھی تک جاری تھی۔ کچھ عرصہ بعد بلی بھی مر گئی۔ نئے مہا پنڈت نے ایک نئی بلی خرید لی۔ عبادت شروع کرنے سے قبل بلی کو رسی سے باندھنے کی رسم بغیر رکاوٹ کے

جاری رہی بلکہ سنا ہے کہ آج تک جاری ہے۔''فلم ختم ہو گئی۔

سمن فلم کی کہانی میں کاروباری اصولوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔اسے احساس ہوا کہ لوگ تبدیلی سے یکدم ہم آہنگ نہیں ہوتے۔ درحقیقت تبدیلی دھیرے دھیرے ہی جڑ پکڑتی ہے۔اسے الجھن میں دیکھ کر شاداب کبیر کہنے لگا۔

''کیا تم سیب کے مربے کو باہر سے دیکھ کر یہ بتا سکتے ہو کہ یہ اچھا ہے یا برا؟''

''نہیں جناب مجھے اسے چکھنا ہو گا۔''

''بالفاظ دیگر تم یہ جاننا چاہو گے کہ مربہ کیسا بنا ہے؟''

''جی ہاں!''

''لوگوں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے احساسات تک پہنچا جائے۔ان کی ظاہری وضع قطع سے ان کی دلی کیفیات کے بارے اندازہ لگانا ایک سراب ہے۔''

یہ سن کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔اسے احساس ہو رہا تھا کہ

کاروباری اداروں میں لوگوں کے رویوں کو سمجھنے کے لیے مسائل کی گہرائی کی طرف جانا ضروری ہے۔

شاداب کبیر کہنے لگا: ''سمن مجھے کچھ اور معاملات دیکھنا ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے ساتھ مزید وقت نہیں بتا سکتا۔ بہتر ہو گا تم کل صبح میرے دفتر آ جاؤ۔''

''ٹھیک ہے۔'' سمن گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

سمن آج کے دن ہونے والے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ اس نے اپنی گزشتہ زندگی کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ اس کاروباری شراکت میں اس نے ایک سال قبل ملازمت شروع کی تھی۔ کاروباری دنیا میں پیش آتی ہوئی مشکلات کو دور کرنے کے لیے سمن نے کبھی اپنے آپ کو کوئی عالم نہیں سمجھا تھا۔ اس نے ہمیشہ عصر حاضر کے اہم رجحانات کو تسلیم کرتے ہوئے ان پر عمل کیا تھا۔ وہ اپنی سوچی سمجھی حکمت عملی کے بارے پر اعتماد تھا لیکن اس ادارہ میں پہلے دن ہی سے اسے اس کے ساتھیوں کا اعتماد حاصل نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کی مدد کرنے میں پس و پیش کر رہے تھے۔ اس نے تبدیلی کے ضمن میں کبھی اتنی زوردار مخالفت کا سامنا نہیں کیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے؟

اگلی صبح وہ شاداب کبیر کے دفتر پہنچ گیا۔ انہوں نے اسے کچھ دیر انتظار کرنے کے لیے کہا۔ آدھ گھنٹے بعد وہ فارغ ہوئے اور کہنے لگے۔ ''آج ہم ایک اور فلم دیکھیں گے!''

''میں تیار ہوں۔''

شاداب کبیر نے ٹیلی ویژن آن کر دیا۔

اسکرین پر ایک دلال نظر آتا ہے جو ایک مکان کے دروازے کو کھٹکھٹا رہا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے ایک خاتون باہر نکلتی ہے۔ دلال اپنا پرچے کراتا ہے اور اپنے ادارے کی قابل بکری اشیاء کی فہرست خاتون کے حوالے کرتا ہے۔ خاتون اس فہرست پر نظر دوڑاتی ہے اور اپنی خرید کی تفصیلات کو تحریر کرنا شروع کرتی ہے۔ خاتون ماضی میں خرید کی ہوئی ان اشیاء کی شکایت بھی کرتی ہے جو غیر معیاری تھیں۔ دلال ایک کاپی پر شکایت کا اندراج کرتا ہے۔ وہ خریداری کے احکامات اور شکایت کی یاداشت کو ایک ہی لفافہ میں بند کرتا ہے اور لفافے کو خاتون کے حوالے کر دیتا ہے تا کہ وہ ان کاغذات کو بذریعہ ڈاک اس کی شراکت کے دفتر بھجوا دے۔ اس کے بعد وہ دوسرے گاہک سے ملاقات کے لیے اپنی تیاری شروع کر دیتا ہے۔ دلال پر اعتماد اور خوش نظر آ رہا ہے۔

کچھ ہی دیر بعد ایک اور منظر سکرین پر ابھرتا ہے۔

دلالوں کی ایک بڑی تعداد ساتھ رہنے والے کمپیوٹر کے استعمال کے بارے ہدایات سن رہی ہے۔ یہ کمپیوٹر حال ہی میں ان دلالوں کے حوالے کیے گئے تھے تاکہ یہ لوگ مزید فعال ہو سکیں اور کارکردگی میں چستی لا سکیں۔ ان کے کاروباری ادارے نے فروخت کرنے کے متعلق حکمت عملی میں تبدیلی کے عمل کا آغاز کر دیا تھا۔ بکری کی حکمت عملی کے لیے نئی ترکیبیں ڈھالی جا چکی تھیں اور ان پر عمل پیرا ہونے کے لیے کمپیوٹر کے استعمال پر انحصار کیا جا رہا تھا۔ شعبہ فروخت کے اعلیٰ افسر نے دلالوں سے کہا۔ ''آپ کا کمپیوٹر ایک مرکزی نظام سے منسلک ہے جو براہ راست قابل فروخت اشیاء کے گودام سے مربوط ہے۔ آپ کا گاہک کمپیوٹر پر براہ راست دیکھ سکتا ہے کہ کون سا مال دستیاب ہے اور اپنی پسند کے مطابق خرید و فروخت کر سکتا ہے اور چاہے تو ماضی میں خرید کئے گئے مال کے بارے شکایت بھی لکھ سکتا ہے۔ آئندہ آپ اس نظام کی جان پہچان اپنے گاہکوں سے کرائیں گے اور اشیاء کی فروخت آن لائن ہو سکے گی۔''

شرکائے محفل نے تسلیم کیا کہ وہ نئے نظام سے مکمل تعارف حاصل کر چکے ہیں۔

ٹیلی ویژن پر ایک نیا منظر ابھرتا ہے۔ پہلے منظر میں جس خوش و خرم دلال کو ہم نے دیکھا تھا وہ سڑک پر چلا جا رہا ہے۔ کیمرہ اس کے چہرے کے تاثرات دکھاتا ہے۔ وہ اداس اور خوف زدہ نظر آتا ہے۔

منظر ختم ہو جاتا ہے۔

شاداب کبیر کہنے لگا۔ ''تم نے مسائل پر غور کیا۔ الجھاؤ' تضادُ کام کی زیادتی یا کمی یہ تمام عناصر کارکردگی میں رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں اور مزاج میں ناچاکی پیدا کرتے ہیں۔''

سمن کہنے لگا۔ ''تحقیق کے بغیر ہم کیسے یہ باتیں کہہ سکتے ہیں؟''

''تم نے فلم میں دیکھا کہ جب دلال کو ٹیکنالوجی استعمال کرنے کے لیے کہا گیا تو اس کا اعتماد ختم ہو گیا؟''

''کیوں؟''

''وہ خوف زدہ تھا۔''

''کیوں؟''

''وہ تبدیلی سے ہم آہنگ ہونے میں پس وپیش کر رہا تھا!''

''درست! لیکن کیوں؟'' اور شاداب کبیر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

کچھ لمحوں بعد وہ مسکرا دیے اور اسے کاغذ کا ایک ٹکڑا تھما دیا اور کہنے لگے:
''اپنے دفتر جاؤ اور اس کا مطالعہ کرو۔''

سمن اپنے دفتر آیا۔ اس نے دیئے ہوئے کاغذ کو کھول کر دیکھا۔ وہاں واسو اور کالی داس نامی لوگوں کے نام اور ٹیلی فون نمبر درج تھے۔ سمن نے ان دونوں سے گفتگو کی۔ دوران گفتگو اس نے محسوس کیا کہ وہ لوگ اس سے بہت پرجوش انداز میں پیش آ رہے تھے۔ دونوں کے دلوں میں شاداب کبیر کے لیے بہت عزت تھی۔

سمن سب سے پہلے واسو سے ملا۔ وہ مقامی اسکول میں استاد تھا۔ اپنے خدوخال میں واسو نسبتاً نوجوان تھا۔ سمن کے اندازے کے مطابق وہ چالیس کے

پیٹے میں تھا۔

''آہا! آؤ بھئی آؤ۔'' داسو گرمجوشی سے کہنے لگا اور اس نے پرزور مصافحہ کیا۔ ''تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ تشریف رکھو۔''

داسو پوچھنے لگا۔ ''کیا تمہاری کل شاداب کبیر سے گفتگو ہوئی تھی؟''

''جی ہاں۔ آپ سے ملنے کا مشورہ انہوں نے ہی دیا تھا۔''

''اوہ میرے خدا۔ بعض دفعہ وہ عجیب وغریب تجربات کیا کرتے ہیں۔ کیا انہوں نے وہ راز بتائے جو کامیابیاں دلاتے ہیں؟''

''آپ کو تو معلوم ہی ہیں۔ بتائیے نا!''

''ابھی بتاتے ہیں۔''

''کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ اصول کامیابی دلاتے ہیں۔'' ممن کہنے لگا۔

''بے شک۔ یہ سچے اور کھرے اصول ہیں۔ آٹھ سال پہلے میں اپنی زندگی سے تنگ آ چکا تھا اور ملازمت کھو بیٹھا تھا اور ایک اوکھلی میں اپنے وطن سے ۸۵۰ کلومیٹر دور رہ رہا تھا۔ میرے کوئی بھی شناسا اور غم گسار نہیں تھا اور میں مایوسی کے عالم میں رہ رہا تھا۔ مسائل سے نکلنے کی کوئی راہ سوجھ نہیں رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے کالے بادلوں نے گھیرے میں لے لیا ہو۔ کامیابی کا راستہ بھول بھلیوں میں گم ہو چکا تھا۔ میں ایک عوامی باغ میں جا کر بیٹھ گیا۔ باغ میں بچے کھیل رہے تھے۔ لیکن میرے ذہن میں مسائل گھوم رہے تھے۔ کچھ ہی لمحوں میں مجھے احساس ہوا کہ میں اکیلا نہیں ہوں بلکہ ایک سادھو بھی میرے ساتھ ہی بیٹھا ہوا ہے۔

سمن کہنے لگا۔ ''اگر میں ان باتوں کو یاداشت کے طور پر لکھ لوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔''

''بالکل نہیں۔'' داسو کہنے لگا۔

اس نے اپنی کہانی جاری رکھی: ''میں کافی بے چینی محسوس کر رہا تھا لیکن مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سادھو میرے تمام مسائل پہلے سے ہی جانتا تھا شاید وہ میرے اندر جھانکنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

''کچھ دیر ہم محو گفتگو رہے۔ سادھو نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے ایسے دوست سے ملنے آیا ہے۔ جسے پیشہ ورانہ معاملات میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ دراصل وہ دوست زندگی میں رواں ایک سنہری اصول کے استعمال کو بھول گیا تھا یعنی ساتھیوں کو اپنی خوشیوں میں شریک کرنا اور ان کے دکھ درد بانٹنا۔

پھر وا سو اپنی باتوں کی تشریح کرنے لگا: ''یہ ایک سادہ سی بات ہے۔ ہمارے ادارے اور کام کرنے کی جگہیں اسی انداز میں کام کرتی ہیں جیسے لوگ ہوتے ہیں۔ یعنی زندہ انسانوں کی طرح۔ ہمارے کردار ہی ان اداروں کے کردار ہیں۔ ہم مسائل کو دیکھنا نہیں چاہتے اور ان کے وجود کو ٹھکرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح بیماری کے علاج کے لیے تشخیص کیجاتی ہے اسی طرح مسائل کے حل کے لیے بھی تشخیص کرنا ہوگی یعنی ابھرتی نشانیاں، تشخیص، دوائی اور پھر بیماری سے چھٹکارا!''

''اس اصول کے بارے مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں تھا۔ میں ان باتوں کو سمجھ ہی نہیں سکا لیکن پھر مجھے احساس ہوا یہ صورت حال کچھ اسی طرح ہے جیسے سادھو نے اس کا تجزیہ کیا تھا۔ میں مکمل ایمانداری سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ حکمت عملی میری زندگی کا ایک اہم سبق تھا۔ دراصل یہ ہی اصول کامیابی کا پہلا اصول ہے۔ یعنی مثبت رویوں کی طاقت کا استعمال۔''

سمن واسو کی گفتگو کو غور سے سن رہا تھا۔

''آیئے میں آپ کو کچھ اور اہم باتیں بتاتا ہوں۔ اکثر ہم اپنے سماجی اصولوں کو بھول جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان اصولوں کی بنیاد پر فوائد حاصل کرنے کے لیے صبر' خواہشات کے حصول کے لیے دھیرے دھیرے آگے بڑھنا اور ایک بامقصد گٹھ جوڑ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب ہم ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھول جاتے ہیں تو ہم واقعات کو رد کرنے کی شکتی کھو بیٹھتے ہیں۔ کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ہماری خواہشات ایسی ہوں جن کا حصول حالات و واقعات کے مطابق ممکن ہو۔ یوں ہم سماجی اصولوں پر ایمان رکھتے ہوئے اپنی اندرونی طاقت کو جگا سکتے ہیں اور یہ جگائی گئی اندرونی قوت ہم میں ایک کامیاب کہانی لکھنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔

سمن پوچھنے لگا۔ ''کیا مسائل کے بارے ہمیشہ مثبت رویہ ہی اپنانا چاہیے؟''

''بالکل درست۔ یہ مشکل بات نہیں ہے۔ درحقیقت ہمارا انداز فکر ماسوائے سوالات کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ ہمیں ہمیشہ ذہنی فکر کی تربیت نو اور تبدیلیوں کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ مثال کے طور ہم اپنے نظام معاوضہ کے

بارے کیوں غور نہیں کرتے یا اپنی قیادت کے انداز میں تبدیلی کے لیے اصرار کیوں نہیں کرتے؟ روزمرہ زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کی زندگی ساحرانہ انداز لیے ہوئے ہے جبکہ دوسرے شخص کی زندگی جمود کا شکار ہے۔ دونوں کے رویوں میں سوچ کے انداز کا فرق ہے۔ انسانی رویہ رنگ کرنے والا وہ برش ہے جس سے ہم اپنی زندگی میں رنگ بھرتے ہیں اور اگر ہم چاہیں تو ہم اپنی مرضی کے رنگ چن سکتے ہیں۔" کیوں؟ اس لیے کہ ہمارے انداز اپنے قائدین سے متاثر ہوتے ہیں۔ غور کریں کہ آپ کا انداز اس ماحول کا حصہ ہے یا نہیں جس میں آپ رہ رہے ہیں۔ اگر اگر ایسا نہیں ہے تو آپ کو اپنے انداز میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ بس میں تمہیں یہ ہی کچھ بتانا چاہتا تھا۔ اپنی زندگی کے ہر فکر میں ان خیالات پر عمل کرو یقیناً کامیابی قدم چومے گی۔

اس شام سمن نے ان یاداشتوں کا مطالعہ کیا جنہیں اس نے داسو سے ملاقات کے دوران تحریر کیا تھا۔ جو کچھ بھی داسو نے بتایا وہ کامیابی حاصل کرنے کا ایک مکمل ضابطہ تھا۔

سمن کی فہرست پر دوسرا شخص کالی داس تھا جو کہ صحت وتندرستی کا مشہور زمانہ استاد تھا۔ شہر میں نہ صرف وہ ایک اکھاڑے کا مالک تھا بلکہ اس نے "کامیابی کی راہوں" کے عنوان سے کئی ایک کتب بھی لکھی تھیں۔

سمن کالی داس کے اکھاڑے پر شام کو ٹھیک آٹھ بجے پہنچ گیا اور اس کے سیکریٹری سے ملا۔ وہ اسے کالی داس کے دفتر لے گیا۔ کالی داس نے اسے خوش آمدید کہا اور اس سے پوچھا۔ ''آپ کیا پینا پسند کریں گے؟ یہاں ہر قسم کے مشروبات موجود ہیں؟''

''شکریہ! میرے لیے پھلوں کا رس بہت اچھا رہے گا۔''

کالی داس نے فوراً ہی سیب کے رس کا ایک کٹورہ سمن کو دیا۔

وہ کہنے لگا۔ ''بھائی صاحب میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''میں خود بھی نہیں جانتا؟'' اور سمن نے اسے اپنی داستان غم سنائی۔

''کیا آپ داسو سے مل چکے ہیں؟'' کالی داس نے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

وہ مسکرا کر کہنے لگا۔ ''کیا آپ کو معلوم ہے کہ میں پہلے وکالت کے پیشے

سے منسلک تھا۔''

''ایک وکیل؟ اور آپ نے وکالت کا پیشہ چھوڑ کر صحت و تندرستی کا استاد بننا کیوں پسند کیا؟''

''مجھے اس کام میں ذہنی آسودگی ملتی ہے۔''

''لیکن کیوں؟''

کالی داس کہنے لگا۔''میں وکالت کے پیشہ سے خوش نہیں تھا۔ہم کبھی اس بات پر غور نہیں کرتے کہ آیا جو کام ہم کر رہے ہیں وہ ہمارے لیے مناسب ہے یا نہیں؟ اکثر اوقات ہم میں صلاحیتوں کی تو کمی نہیں ہوتی لیکن انجانے خوف تبدیلیوں کا سامنا کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اگر ہم لوگوں کو تبدیلی سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان کی مدد کرنا ہوگی۔ انہیں نئی صلاحیتوں سے متعارف کرانا ہوگا تا کہ دھیرے دھیرے وہ نئی صلاحیتوں سے واقفیت حاصل کرسکیں۔ درحقیقت صلاحیتوں کو سیکھنے کا رویہ انہیں تبدیلی سے ہم آہنگ کردے گا۔ہمیں اپنے ساتھیوں پر اعتماد بھی کرنا ہوگا کیوں کہ بے اعتمادی سمجھنے کی صلاحیت ختم کر دیتی ہے۔ اعتماد سازی ایمانداری سے بڑھ کر قدم ہے اور یہ

آ گہی کی طرف لے جاتی ہے۔

سمن کہنے لگا۔ ''میرا ذہن آہستہ آہستہ ان الجھنوں کو حل کرنے کے لیے واضح ہو رہا ہے۔''

کالی داس کہنے لگا۔ ''آپ جس چیز پر ایمان رکھتے ہیں اس کا اظہار کیجئے۔ ہمیں دوغلے پن سے دور رہنا ہوگا۔ ہمیں سماجی رویوں' ایمان اور عمل کے درمیان تعلق اور تسلسل رکھنا ہوگا۔ اپنے ساتھیوں سے کہو کہ وہ تبدیل شدہ انداز سے نئی نئی صلاحیتوں کو سیکھیں۔ یہ تبدیلیاں منافع بخش' آ گہی افروز' صلاحیتوں سے بھرپور' فائدہ مند' ہم آہنگ اور معیاری فضا وجود میں لائیں گی جہاں تخلیق اور جدت پسندی وجود میں آ سکتی ہے۔ یاد رکھو بین الاقوامی سطح پر معیاری خدمت دینے والے وہ ادارے ہوں گے جن کے پاس ٹیکنالوجی کا اضافی علم ہوگا جو کہ منڈیوں میں واضح برتری دلاتا ہے۔''

سمن کہنے لگا۔ ''کالی داس صاحب بہت بہت شکریہ۔ میرے علم میں بہت اضافہ ہوا ہے۔''

سمن ان واقعات پر غور کر رہا تھا جو پچھلے چند ہفتوں میں پیش آئے

تھے۔ اسے احساس ہوا کہ اس کی تیزی سے ہوتی ہوئی ترقیاں اور بدلتی ہوئی نوکریوں نے اسے کبھی لوگوں کی نفسیات اور ان کے احساسات کو سمجھنے کا موقع نہیں دیا۔ اسے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ لوگوں کے انداز کس قدر پیچیدہ ہوتے ہیں اور کس طرح مستقل طور پر ادارہ کے اندرونی ماحول اور کاروبار کے مخصوص اقدار کے مابین ہم آہنگی پیدا کی جاتی ہے اور مشکلات سے کیسے نبرد آزما ہونا چاہیے؟ کیا وہ شروع ہی سے کئی ایک غیر معمولی غلطیوں کا ارتکاب نہیں کر رہا تھا؟ درحقیقت اسے احساس ہوا کہ کام کی مانگ اور اس کے حصول کے طریق کار کے مابین ہم آہنگی کا فقدان ماحول میں بے ڈھنگا پن اور غیر مستعدی پیدا کرتا ہے۔ آج وہ ایک حقیقت پسند طریقہ کار کو سمجھ چکا تھا۔ رویوں کی اس تبدیلی سے ماحول میں کاروبار کے فروغ کے لیے بہتری متوقع تھی۔

اگلے روز اس نے اپنے ساتھیوں کا اجلاس طلب کیا اور انہیں اپنے کاروبار میں درپیش مسائل کی للکار سے آگاہ کیا۔ اس نے حالات میں بہتری کے لیے ان کی رائے پوچھی۔ ان لوگوں نے بعض بہت اچھی تجاویز پیش کیں۔ اب وہ گردوپیش کے ماحول کی للکار کے ساتھ ساتھ تھا۔ اس کے ساتھیوں نے کاروبار کے مرکزی مسائل کا احاطہ کیا اور درپیش للکار کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ ہوگئے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کے کاروبار کی منفعت میں اضافہ ہوسکے۔

اس کے ساتھی آج اسے پر اعتماد، مددگار، حقیقت پسند اور دوست کی حیثیت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ سب حیران پریشان تھے۔

دوپہر کے کھانے کے وقفہ کے دوران سرگوشیوں میں یہ کہا جا رہا تھا:

''ہمارے افسر کو کیا ہو گیا ہے؟''

ڈیلفی مندر۔۔۔ایک سوالیہ نشان؟

استنبول کے ہوائی اڈہ پر میں ایتھنز کے لیے روانگی کا منتظر تھا۔ اڑان میں کچھ تاخیر تھی۔ میں اپنے خیالات میں گم میں کہیں اور ہی کھویا ہوا تھا۔ میرے خیالات کا تانا بانا اس نشریے نے توڑ دیا: ''اولمپک ہوائی شراکت اپنی اڑان ۲۳۱ کی روانگی کا اعلان کرتی ہے۔ مسافروں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ جہاز پر تشریف لے جائیں۔'' میں نے اپنے دستی سامان کو سنبھالا اور جہاز میں سوار ہونے کے لیے روانہ ہو گیا۔

کچھ دیر بعد اولمپک ہوائی شراکت کا جہاز بوئنگ ۷۲۷ جہاز پٹی پر دھیرے دھیرے اچک کے مقام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اڑن مینار میں اداراتی عملہ اس بات سے پریشان تھا کہ ناگزیر حالات کی بناء پر اولمپک ہوائی شراکت کے جہاز کو اڑان کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔

اب جہاز کے عملہ کو اڑان کے لیے ہدایت ملنا شروع ہو چکی تھیں۔ ہوا باز سن رہا تھا: ''بوئینگ ۲۳۱ اولمپک ہم استنبول کے اڑن مینار سے گفتگو کر رہے ہیں۔ آپ کو اڑان کی اجازت دی جا رہی ہے۔ اڑان کے بعد آپ ۱۴۰ ڈگری کے زاویے پر دائیں کو گھومیں گے۔''

جہاز کے کپتان نے اپنے مائیکروفون پر کہا: ''راجر بوئینگ ۲۳۱ کو اڑان کی اجازت ہے اور وہ اڑان کے بعد ۱۴۰ ڈگری کے زاویے پر اپنے دائیں گھومے گا۔''

کچھ ہی دیر بعد قوی ہیکل جہاز نے اڑن پٹی پر دوڑنا شروع کیا اور پھر وہ پرواز کر گیا۔ جہاز کے معاون پائلٹ نے اڑن مینار کو اطلاع دی کہ اڑتا ہوا بوئنگ ۲۳۱ تین ہزار فٹ کی بلندی سے نکل کر ۷۰۰۰ ہزار فٹ کی بلندی کی طرف محو پرواز ہے۔ جونہی جہاز نے اپنی مقررہ اونچائی حاصل کی تو معاون ہوا باز کپتان سے یوں مخاطب ہوا: ''ہماری پرواز میں چار گھنٹے کی تاخیر ہے۔ مسافر پرواز کے لیے بہت بے چین تھے۔''

''اب وہ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟''

معاون ہوا باز نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر جہاز کے پچھلے حصے کی طرف جھانکا اور کہنے لگا۔ ''وہ مطمئن نظر آتے ہیں۔''

میں جیسے ہی اپنی نشست پر بیٹھا تو ایئر ہاسٹس کہنے لگی۔ ''اپنا سیٹ کارڈ دکھاؤ؟''

میں نے سفری تھیلے سے سیٹ کارڈ نکال کر اسے تھما دیا۔

وہ کہنے لگی۔ ''تمہارے لیے اچھی خبر یہ ہے کہ تمہیں فرسٹ کلاس میں بیٹھنے کے لیے چنا گیا ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔''

میں ایئر ہاسٹس کے ہمراہ فرسٹ کلاس میں پہنچ گیا۔ وہ کہنے لگی۔ ''سیٹ 1-A پر بیٹھ جاؤ۔''

سیٹ پر بیٹھتے ہی میں نے کہا: ''شکریہ۔''

میں اپنے خیالات میں گم اس سفر کے بارے غور کر رہا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کیوں ڈیلفی مندر کی یاترا کے لیے یونان جا رہا تھا؟ ڈیلفی

مندر دیکھنے کی خواہش تو یقینی تھی لیکن یہ کوئی روحانی سفر نہیں تھا۔ دراصل ایک ان دیکھی مقناطیسی قوت مجھے یہاں کھینچ کر لائی تھی۔ شاید ڈیلفی مندر کے بارے پھیلی ہوئی روایتی کہانیاں اس کشش کی وجہ بنی ہوں لیکن یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

خیالات کے تانے بانے سے نکل کر میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ چاروں اور سمندر پھیلا ہوا تھا۔ ہم بحیرہ روم پر سفر کر رہے تھے۔ پانی کے جہاز ادھر ادھر جاتے ہوئے دکھائی رہے تھے۔ سمندر کا نیلا پانی دھوپ میں چمک رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے چاروں اور نیلے اور سفید رنگ کو پھیلا دیا ہو۔ میرے خیالات کا تانا بانا اس اعلان نے توڑ دیا: ”خواتین وحضرات ہم جلد ہی ایتھنز کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں۔ اپنے نشست بند باندھ لیجیے اور اپنی نشستوں کو سیدھا کر لیں۔“

ہوائی اڈہ پر سوسن میری منتظر تھی اور وہ ایک ایسے مقام پر کھڑی ہوئی تھی جہاں سے اسے آنے والے مسافر بخوبی نظر آ رہے تھے۔ جونہی اس نے مجھے دیکھا وہ چلائی۔ ”اس جانب۔“ اور کہنے لگی۔ ”کیا مجھے مسٹر ڈی کو پہچاننے میں کوئی غلطی تو نہیں ہوئی؟“

''بالکل نہیں۔''

''ہوٹل ایتھنز ہلٹن میں تمہاری رہائش کا انتظام ہے اور کل صبح ساڑھے چھ بجے ڈیلفی مندر لے جانے کے لیے ڈرائیور تمہارے پاس پہنچ جائے گا؟''

''بہت خوب۔''

''اچھا ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ یہ تمہیں ہوٹل لے جائے گی۔'' وہ کہنے لگی۔

کار جدید ایتھنز کے مرکز سے گزر رہی تھی۔ شہر دلہن کی طرح خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ سڑک کنارے مالٹے کے درختوں کے جھنڈ نظر آ رہے تھے۔ ہرے رنگ کے درختوں پر پیلے پیلے لٹکتے ہوئے مالٹے حسین منظر پیش کر رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد کار کی رفتار میں کمی آنے لگی اور بالآخر وہ ہوٹل کے دروازے پر رک گئی۔ میں کار سے باہر نکلا۔ ہوٹل کا میزبان کونا بالکل سامنے نظر آ رہا تھا۔

میزبان کلرک کہنے لگی۔ ''کتنے روز کا قیام ہے؟''

''دو رات کا۔''

''آپ کا نام؟''

''ذی!''

''استنبول سے آ رہے ہو؟''

''جی ہاں!''

''اس فارم کو پر کر دیجیے۔''

میں نے فارم پر کر کے اس کے حوالے کر دیا۔ میزبان کلرک کہنے لگی۔

''یہ کمرے کی چابی ہے اور کمرہ ہوٹل کی پانچویں منزل پر ہے۔ اپنے کمرے میں جا کر تھکان دور کیجیے۔''

''شکریہ۔''

میں اپنے کپڑے تبدیل کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ''ہیلو! کون بول رہا ہے؟''

''میں سوسن بات کر رہی ہوں یاد دلانے کے لیے کہ کل صبح ساڑھے چھ بجے ڈیلفی مندر جانا ہے۔''

''اس یاد دہانی کا شکریہ!''

اگلی صبح جب میری آنکھ کھلی تو ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ میں نے نہا کر کپڑے پہنے اور نیچے لابی میں جا کر ناشتہ شروع کیا۔ جب میں چائے پی رہا تھا تو خاکی لباس زیب تن کیے ہوئے ایک فربہ اندام شخص نے میرے پاس پہنچ کر کہا۔ ''تم ہی ـــــــــــ ہو؟''

میں نے کہا۔ ''چلو بھئی میں ڈیلفی مندر جانے کے لیے تیار ہوں۔''

وہ کہنے لگا۔ ''میرا نام اونس ہے اور میں پچھلے ۲۰ سال سے ٹیکسی چلا رہا ہوں۔ ڈیلفی مندر کی یاترا کے لیے آپ کا لباس موزوں نہیں ہے۔ وہاں ٹھنڈ ہو گی۔ بہر حال آپ ٹیکسی میں تشریف رکھیں میرے پاس ایک اضافی سویٹر موجود ہے اگر ضرورت پڑی تو اسے استعمال کر لیجیے گا۔''

''آؤ پھر چلیں۔''

ٹیکسی ایتھنز کے شمال کی طرف رواں تھی۔ جونہی ہم مرکز شہر سے باہر نکلے تو ہر طرف خوبصورت کوٹھیاں' ہرے باغات اور بڑے بڑے فارم ہاؤس نظر آ رہے تھے۔ ہر جانب تعمیر جاری تھی۔ مضافات میں روایتی مکانوں کی جگہ جدید عمارتیں لے رہی تھیں۔

میں سوچ رہا تھا کہ یونان کسی زمانے میں نہایت بلند پایہ سماج کا مرکز تھا۔ اسکندر' سقراط' افلاطون' ہومر سیفو اور ارسطو جیسے عظیم لوگوں نے یہاں جنم لیا۔ اپالو دیوتا کے نام پر بنا ہوا ڈیلفی کا مندر پرناسس پہاڑ کے دامن میں واقع تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں آسمان سے دیوتاؤں کا نزول ہوتا تھا جو مندر کے پجاریوں کے ذریعے لوگوں سے گفت وشنید کیا کرتے تھے۔ ہر یونانی کے لیے زندگی میں ایک دفعہ ڈیلفی مندر کی یاترا فرض تھی۔ اس مندر کا شمار دنیا کے سات عجوبوں میں ہوتا تھا۔

میں انہی خیالات میں گم تھا۔ اچانک کار کی رفتار میں کمی آنے لگی اور میرے خیالات کا تانا بانا ٹوٹ گیا۔ اب میں منزل مقصود پر پہنچ چکا تھا۔ سڑک کنارے ایک نیلا بورڈ آویزاں تھا یہ بتانے کے لیے کہ مندر کا مقام یہی ہے۔

مندر کے اندر داخل ہوتے ہی مجھے احساس ہوا کہ ڈیلفی مندر ایک پراسرار جگہ ہے۔ یہاں سکندر' نیرو اور کروسیس جیسے عالی شان حکمران اور ہومر جیسے

شعراء اپنی منتیں مانگنے کے لیے آئے تھے۔ لیکن آج مندر کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا ہے۔ کبھی یہ مندر انتہائی پر شکوہ اور شاندار تھا۔ مجھے عظیم رومن شعلہ بیاں مقرر سکرو کے الفاظ یاد آئے جس نے کہا تھا۔ ''ڈیلفی مندر نے جس خوشحالی' شان اور عزت کو دیکھا وہ مقام مندر کے ذہین پجاریوں کی وجہ سے حاصل ہوا۔''

آج مندر کی یاترا کے لیے میرے علاوہ کوئی بھی یاتری نہیں تھا۔ میں اکیلا ہی گھوم رہا تھا۔ چاروں اور فضا اداس اداس تھی مگر مندر کے کھنڈرات اس کے ماضی کی شان کی یاد دلا رہے تھے۔ ہر جانب خاموشی ہی خاموشی تھی اور جب کبھی ہوا کا زوردار جھکڑ ان کھنڈرات سے ٹکراتا تو یوں لگتا تھا جیسے کوئی مندر کی زبوں حالی پر نوحہ کناں ہے۔ مقام عبادت' اسٹیڈیم' تھیٹر' سکول' میونسپل دفتر اور مقام قربانی اب کھنڈرات کا حصہ بن چکے تھے۔ مگر مندر کا ڈیزائن اور وہاں لکھی ہوئی تحریریں اب بھی حیران کن تھیں۔

میں مقام عبادت کے گرد گھوم ہی رہا تھا کہ اچانک محسوس ہوا جیسے کوئی مجھے پکار رہا ہے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ قریب ہی ایک بڑھیا کھڑی ہوئی تھی۔

''تم کون ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں کئی دنوں سے تمہاری منتظر تھی۔''

''مادام! کیا تم مذاق کے موڈ میں ہو؟''

''ایسا نہیں ہے بچہ! افسوس تو یہ ہے کہ تم نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں مندر کی پجارن ''پھتیا'' ہوں۔''

''کیا تم ابھی تک پجارن کا کام کر رہی ہو؟''

''ہاں! لیکن یہ تو بتاؤ تم مجھے کیوں نہیں پہچان سکے؟''

''میں یہاں کبھی آیا ہی نہیں۔ پہلی دفعہ یونان آیا ہوں۔''

''تمہیں یقین ہے کہ تم یہاں کبھی نہیں آئے؟''

''جی ہاں!''

''میرے ساتھ آؤ۔''

جلد ہی ہم میونسپل ہال تک پہنچ گئے۔ اس کی دیواریں ابھی تک صحیح سلامت تھیں۔

''ادھر دیکھو۔'' اس نے دیوار کی جانب اشارہ کیا۔

جونہی میں نے دیوار کی جانب دیکھا وہاں تصویریں ابھرنا شروع ہو گئیں ویسے ہی جیسے ہم ٹیلی ویژن اسکرین پر دیکھتے ہیں۔ قریب کھڑی بڑھیا پجارن کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ ایک شخص جو میرا ہمزاد نظر آ رہا تھا اس کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ میں یہ منظر دیکھ کر سکتے میں آ گیا۔ میری حیرانی ابھی ختم ہی نہیں ہوئی تھی کہ تصویر میں ایک شخص جنرل کا لباس زیب تن کئے ہوئے آتا ہے اور پجارن سے کہتا ہے:

''مجھے میرا مستقبل بتاؤ؟''

پجارن کہنے لگی۔ ''مستقبل بتانے کے لیے ابھی سے ٹھیک نہیں ہے۔''

''مجھے انکار سننے کی عادت نہیں ہے پجارن۔ میں اسکندر ہوں مجھے ابھی آنے والے کل کی خبر دو۔''

''جنرل تمہیں معلوم ہونا چاہیے ڈیلفی مندر کی پجارن کسی کی غلام نہیں ہے۔ جنرل تم اپالو دیوتا کے مندر میں حاضری دے رہے ہو یہاں دنگا مت کرو اور واپس چلے جاؤ۔ آنے والے سمے کی جانکاری کے لیے پھر آنا!۔''

جنرل کا چہرہ سرخ ہو گیا اس نے پجارن کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا مقدس چشمے کے مقام پر لے گیا اور کہنے لگا: ''اسکندر کے لیے ہر وقت مناسب ہے۔ مجھے مزید ناراض مت کرو ورنہ انجام بھیانک ہوگا۔ جاؤ عبادت کرو اور مجھے بتاؤ کیا میں اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاؤں گا؟''

پجارن کا ایک سانس آ رہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا اس نے بڑی مشکل سے اپنا بازو چھڑایا اور کہنے لگی۔ ''اگر تم آنے والے سمے کو جاننے کے اتنے ہی خواہش مند ہو تو سنو۔ دنیا تمہیں ایک عظیم فاتح کی حیثیت سے یاد کرے گی لیکن تم میدوں کے ملک (ایران) سے زندہ واپس نہیں لوٹو گے۔ ہاں تمہارے دشمن بھی تمہارا نام عزت سے لیں گے۔''

اسکندر یہ سن کر کچھ دیر خاموش رہا اور پھر چلا کر کہنے لگا۔ ''اے قسمت کے مقدس دیوتا میری بات سن۔ میں مطمئن ہوں کہ لوگ مجھے عزت سے یاد کریں گے۔''

دیوار پر تصویریں ابھی تک ابھر رہی تھیں:

ایک شخص سفیر کا لباس پہنے پجارن کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ پجارن میرے ساتھ کھڑی ہوئی بڑھیا نہیں تھی بلکہ کوئی اور راہبہ تھی۔ سفیر نے پجارن سے سوال کیا۔ ''بادشاہ کروسس یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ایرانی حکمران کوروش اعظم سے لڑائی میں وہ جیتیں گے یا نہیں؟''

پجارن نے سوال غور سے سنا اور کہنے لگی۔

''کہو جا کر یہ بادشاہ سے گر
حملہ آور کرتا ہے پار ہیلوس دریا کو
برباد ہو جائے گی ایک عظیم سلطنت۔''

''کیا میں جان سکتا ہوں کہ ہمارا بادشاہ کب تک حکمران رہے گا؟''
وہ کہنے لگی:

''حکمرانی رہے گی جب تک
نہ بن بیٹھ جاتا ایک بہادر شخص

میدیا کے تخت پر

بولنا شروع کر دیا گر گونگے شہزادے نے

تو آفت آئیگی بادشاہ پر

ختم ہو جائے گی حکومت بادشاہ کی

چاہیے بادشاہ کو

لڑائی سے پہلے اپنے تعلقات وسیع کرے

یونانیوں سے جو طاقت ور ہیں

ہاں بادشاہ زندہ بچ جائے گا آگ سے

کھو بیٹھے گا لیکن حکمرانی"

سفیر نے جواب غور سے سنا اور وہ اپنے حکمران کو یہ پیغام دینے چلا گیا۔

ایک اور منظر ابھرتا ہے:

ایک بادشاہ مندر میں داخل ہو رہا ہے۔ پجارن اسے دیکھ کر چلائی اور کہنے لگی۔ "اے اپنی ماں کے قاتل اپنے ناپاک قدم مندر کی دھرتی پر مت رکھو۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ ہاں نمبر ۷۳ سے بچ کر رہنا۔"

Scanned with CamScanner

بادشاہ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔اس نے حکم دیا کہ مندر کو ڈھادو اور پجارن کو زندہ دفن کردو۔سپاہیوں نے بادشاہ کے حکم کی تعمیل کی۔

واقعات کی اک اور منظر کشی:

مندر کھنڈروں میں تبدیل ہو چکا ہے۔مقدس چشمے سے پانی نکلنا بند ہو چکا ہے۔اک بادشاہ ان کھنڈرات پر کھڑا ہے۔

''پجارن کہاں ہے؟''

اک نوجوان پجارن باہر نکلی اور کہنے لگی۔''میں یہاں ہوں۔تم یہ جاننے آئے ہو کہ کیا تم بادشاہ بن جاؤ گے۔تو سنو تم روم کے بادشاہ بن جاؤ گے۔''

بادشاہ نے سپاہیوں کو حکم دیا۔

''مندر کو ڈھادو۔''

مندر کو مکمل طور پر مسمار کردیا گیا۔

دیوار پر تصویریں ابھی تک ابھر رہی تھیں:

اداس اداس پجارن مندر کے کھنڈرات پر بیٹھی ہوئی تھی۔ شاہی طبیب وہاں آتا ہے۔ وہ پوچھنے لگا:

''پجارن کیا تم بتاؤ گی کہ بادشاہ سلامت اپنی بیماری سے کب صحت یاب ہوں گے؟''

''وہ جلد ہی صحت یاب ہو جائیں گے۔ مگر بادشاہ کو کہنا کہ اپالو دیوتا کے نام پر تعمیر کیا گیا ڈیلفی مندر ہمیشہ زندہ رہے گا۔''

میں نے پجارن سے پوچھا۔ ''یونانی اپنی پرم پرا کو بچانے میں کیوں کامیاب نہیں ہو سکے؟''

کوئی جواب نہیں ملا چاروں اور خاموشی تھی۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو پجارن غائب تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور میرے پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔

میرے چہرے پر ابھرنے والی حیرت کو دیکھ کر وہ کہنے لگا: ''تم خالی دیوار کو گھور رہے تھے اور اپنے آپ سے باتیں کر رہے تھے۔''

''میں تو ڈیلفی مندر کے عروج وزوال کی داستان کے بارے پجارن سے گفتگو کر رہا تھا۔

''یہاں کوئی پجارن نہیں رہتی۔ سنا ہے کہ آخری پجارن کی روح یہاں بھٹکتی پھر رہی ہے اور کبھی کبھی لوگوں کو دکھائی دیتی ہے۔''

''ایک ناقابل یقین بات۔۔۔۔ ہے نا؟''

واپسی کے سفر کے دوران پچھلے دو گھنٹے میں بیتے ہوئے واقعات میرے ذہن میں گھوم رہے تھے۔ میں مندر کے موجودہ دور پر غور کر رہا تھا۔ مندر اپنے مقاصد میں شاید ناکام رہا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ مندر آج بھی ایک پراسرار مقام ہے اور ممکن ہے کہ لوگ آج بھی اپنا مستقبل تراشنے وہاں جاتے ہوں۔

ماضی کے لمحوں میں رہتے ہوئے

میں ہالیڈے ان گورنمنٹ سینٹر بوسٹن کے باہر سڑک کنارے ٹیکسی کے انتظار میں کھڑا ہوا تھا۔ یہ ہوٹل مرکز شہر میں میساچوسٹس جنرل ہسپتال کے سامنے واقع ہے۔ موسم ابر آلود تھا اور درجہ حرارت نقطہ انجماد سے بھی کہیں زیادہ نیچے تھا۔ جونہی ٹیکسی وہاں آ کر رکی میں جلدی سے اس میں بیٹھ گیا اور اسے عمارت نمبر 1915 واقع فل ھیم مارلبرو چلنے کے لیے کہا۔ میری ایک جوتشی سے ملاقات طے تھی۔ میں جانا چاہتا تھا کہ قسمت کی دیوی نے میرے لیے کیا مستقبل تراش رکھا ہے؟

''ہم مارلبرو پر کتنی دیر میں پہنچیں گے؟''

''اس وقت سڑکوں پر ریل پیل کی بھرمار ہے

زیادہ وقت لگ سکتا ہے!''

بوسٹن میرے لیے کوئی نئی جگہ نہیں تھی۔ لیکن گرد و پیش کو سمجھنے میں مجھے کچھ وقت لگا۔ جونہی میں ماحول سے آشنا ہوا میرے اعتماد میں اضافہ ہو گیا۔ ماحول کی خاموشی کو ٹیکسی ڈرائیور کی آواز نے توڑ دیا: ''کہاں سے آئے ہو؟''

''پاکستان سے۔''

''وہی ملک جہاں ایک خاتون بنام بھٹو وزیراعظم ہے؟''

''ٹھیک کہا۔ لیکن آج کل وہ وزیراعظم نہیں ہے۔''

''میں تمہارے ملک کے بارے سوچ سوچ کر اکثر حیران رہ جاتا ہوں۔ وہاں غربت ہے' طاقتور جتھوں نے شہروں پر قبضہ جمایا ہوا ہے' بنیاد پرستی بڑھ رہی ہے اور خواندگی کی شرح انتہائی کم ہے۔ وہاں معیشت کیسے نمو پذیر ہو گی؟''

''تم تو سماج اور تاریخ کی اچھی خاصی واقفیت رکھتے ہو۔''

''میں کتابیں پڑھنے کا شوقین ہوں اور میرا پسندیدہ مضمون ''تاریخ'' ہے۔ میں نے برصغیر کی تاریخ کو اچھا خاصا پڑھا ہے اور جانتا ہوں کہ برصغیر کو کیوں سامراجی طاقتوں نے تقسیم کرایا تھا۔''

برصغیر کے بارے اس کا علم حیران کن تھا۔ وہ برصغیر کے لوگوں اور ان کے سماج اور تاریخ کے بارے بہت کچھ جانتا تھا۔

''آج صبح سے بہت تیز ہوا چل رہی ہے۔'' وہ کہنے لگا۔

''امید ہے کہ اس کا زور زیادہ دن نہیں رہے گا۔ یہاں تو نومبر تک موسم خوشگوار رہتا ہے؟''

''اچھا تم جانی پہچانی جگہ پر ہو۔''

''تم مجھے امریکی نژاد نظر نہیں آتے؟''

''میں فرانس میں پیدا ہوا تھا۔ پچیس سال پہلے یہاں سیاحت کے لیے آیا تھا۔ اسی دوران ایک امریکی خاتون سے شادی کر لی۔ وہ دن اور آج کا دن

میں یہاں کا ہو کر رہ گیا ہوں۔"

"تم مطمئن تو نظر آ رہے ہو مگر کیا واقعی تم خوش ہو؟"

"مناسب پیسے کما لیتا ہوں اور اچھی زندگی بسر کر رہا ہوں۔"

چاروں اور برف گر رہی تھی۔ درختوں کے پتے جھڑے ہوئے تھے۔ خزاں کا موسم اپنے جوبن پر تھا۔ میں اس بے رنگ موسم کے بارے سوچ ہی رہا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور بولا:

"موسم بہار میں سب کچھ تبدیل ہو جائے گا۔ درخت ہرے بھرے ہو جائیں گے۔ پھول کھل اٹھیں گے اور بہار کی مہک والی ہوا دلوں میں آرزو جگائے گی۔ لوگ باغوں میں گھومیں گے اور سمندر کنارے جائیں گے۔ ان دنوں کوئی بھی تنہائی محسوس نہیں کرتا۔"

"کیا یہ شخص اپنے گاہکوں کے ذہنوں کو پڑھنا جانتا ہے؟" میں نے دل میں کہا:

''یادش بخیر!'' اس کی جوش بھری آواز سنائی دی۔ ''بوسٹن اور اس کے قریب و جوار میں ہر سال دس لاکھ طالب علم پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ زیادہ تر نامور درسگاہیں اس علاقہ میں واقع ہیں۔ یہاں کی معیشت خاصی ترقی یافتہ ہے اور لوگوں کو ملازمتیں آسانی سے مل جاتی ہیں۔ اس بناء پر بعض اوقات مزدور نہیں ملتے۔ تم نے ایم آئی ٹی کا نام تو سنا ہی ہوگا وہ درسگاہ بھی یہاں پر ہی واقع ہے۔ جدید ترین ایجادات اور صحت افزائی سے متعلقہ نمو پذیر ہوتے ہوئے علاج اور دوائیں اسی ادارہ کی ایجادات ہیں۔ دنیا کے ہر اور سے مریض اپنے علاج کی خاطر یہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر جانی پہچانی ہارورڈ یونیورسٹی بھی یہاں پر ہی واقع ہے۔''

''اس ٹیکسی ڈرائیور کی معلومات یقیناً قابل تعریف ہیں۔'' میں نے دل میں کہا۔

''تمہارے کتنے بچے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میری دو لڑکیاں ہیں۔''

''کیا وہ شادی شدہ ہیں یا پڑھ رہی ہیں؟''

’’دونوں ہی بوسٹن یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں۔ کیا تم نے بوسٹن یونیورسٹی کا نام سنا ہے؟ یہ بھی خاصی مشہور درسگاہ ہے مگر مہنگی ہے۔ میری آمدن کا زیادہ تر حصہ ان دونوں کے تعلیمی اخراجات پر خرچ ہو جاتا ہے۔ جلد ہی وہ دونوں کمانا شروع کر دیں گی اور میں سیاحت کے لیے آزاد ہو جاؤں گا۔ مجھے سیر د سیاحت بہت پسند ہے۔‘‘

’’تمہارے گاہک تو تمہاری گفتگو سے بہت خوش ہوتے ہوں گے؟‘‘

’’گاہکوں کو خوش رکھنا اتنا آسان نہیں ہے۔ کچھ لوگ تو موسم کے بارے گفتگو کرتے ہیں، کچھ نئی ایجادات کے بارے جاننا چاہتے ہیں اور کچھ موج کرنا چاہتے ہیں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ میرے گاہکوں کو نئی فضا کو جاننے پہچاننے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اس پیشہ کی اچھی بات یہ ہے کہ میرے گاہک ہی میری معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے وطن کے بارے تفصیلات بتاتے ہیں اور میرے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔ مجھے بھی نت نئے لوگوں سے مل کر خوشی ہوتی ہے۔‘‘

’’بہت خوب!‘‘

وہ مسکرانے لگا۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں اور ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ ہونے والی گفتگو پر غور کرنے لگا۔ اچانک ایک کہاوت میرے ذہن میں ابھری۔ کسی نے کہا تھا:

''وہ لوگ جو علم سیکھنا بند کردیتے ہیں ان کی نمو ختم ہو جاتی ہے جو ہار مان لیتا ہے وہ جیت نہیں سکتا اور تبدیلی سے گریز ترقی کو روک دیتا ہے۔''

یہ سوچ کر کہ میرا شمار ان درجہ بندیوں میں نہیں ہوتا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ہم ابھی تک روبہ سفر تھے۔

''تمہارا ذریعہ معاش کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں ایک وکیل ہوں۔''

''پھر تو تم کافی مالدار ہو گے؟''

''کبھی کبھار تو ہم لوگ اچھے خاصے پیسے کماتے ہیں مگر بعض اوقات ہمیں صبر بھی کرنا پڑتا ہے۔''

''اس ملک میں تو ڈاکٹر اور وکیل بہت مالدار لوگ ہیں!''

''اچھا کچھ اپنے بارے بھی تو بتاؤ۔تم نے یہاں شادی کی اور اب تمہارے دو بچے ہیں۔کیا واقعی تم دلی طور پر خوش ہو؟''

''میں ہاں بھی کہہ سکتا ہوں اور نہیں بھی!''

''کیوں؟''

''میں خوش ہوں کہ صاحب روزگار ہوں اور اچھی آمدن ہے۔ناخوش ہوں کہ پچھلے 25 سال سے میں اپنے وطن کی یاد میں مبتلا ہوں۔''

مجھے ایک بدھی مان کی بات یاد آئی۔اس نے کہا تھا: ''ہر آدمی کے ذہن میں ایک تصوراتی خاکہ ہوتا ہے کہ اسے کیا حاصل کرنا ہے۔یہ تصور بہت اعلیٰ اور پیچیدہ ہوسکتا ہے اور اس کے برعکس یہ بہت معمولی اور ادنیٰ بھی ہوسکتا ہے۔تصور کی پیچیدگی اور سادگی سے ہی اس کے مقاصد میں کامیابی یا ناکامی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔''

"کیا تمہیں نیند آ رہی ہے؟"

"نہیں تو۔"

"ہم آج کہاں کھڑے ہیں یا کس طرف جا رہے ہیں اہم بات نہیں ہے۔ اپنے مقصد حاصل کرنے کے لیے بلا تھکان کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمیں زندگی میں درپیش آنے والی للکار سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ میں انہی اصولوں کو اپنا کر اس مشکل معاشرے میں کامیاب زندگی گزار رہا ہوں۔"

"مجھے تو تم ٹیکسی ڈرائیور کم اور فلسفی زیادہ نظر آتے ہو۔"

"میں فلسفی تو نہیں ہوں لیکن ہر شخص زندگی کے بارے کچھ نہ کچھ تصورات کا مالک ہوتا ہے۔ میرے خیال میں زندگی کے رویوں میں رومان پروری ہونی چاہیے ورنہ زندگی ساکت ہو جاتی ہے۔"

"کیا تم سگریٹ پیتے ہو؟"

''جی ہاں۔''

''تو سگریٹ پیو نا۔''

''بہت بہت شکریہ!''

''تم یہاں پر بہت عرصہ سے رہ رہے ہو نا؟''

''جی ہاں!''

''تم نے اپنے وطن اور یہاں کے معاشرے میں کیا فرق محسوس کیا ہے؟''

''امریکی اور فرانسیسی سماج میں بہت فرق ہے۔''

یہ بات میرے لیے ناقابل یقین تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ مختلف مغربی معاشروں میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ بظاہر وہ سب ایک جیسے ہی نظر آتے ہیں۔ ایک ڈنمارک کی رہنے والی میری ہمجولی نے کہا تھا کہ ہمارے اور امریکی

سماج میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مگر یہ فرانسیسی مختلف بات کر رہا تھا۔

''امریکی اور فرانسیسی سماج میں کیا فرق ہے؟''

''میں نے ایک مختلف ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ مجھے سکھایا گیا تھا کہ ہم دوسروں کے ساتھ نرمی سے پیش آئیں۔ اپنی برادری سے رواداری کا سلوک کریں اور زندگی میں قناعت اور صبر سے کام لیں۔ امریکہ میں تو ہر کوئی پیسہ کمانے میں مصروف رہتا ہے اور اگر ایسا نہ سوچا جائے تو گزارہ نہیں ہو سکتا۔ میں اس تگ و دو سے تنگ آ چکا ہوں۔''

''تم نے یہاں ٹھہرنے کا فیصلہ کیوں کیا تھا؟''

''میں نے یہاں شادی کر لی تھی۔ ابتدائی دنوں میں جذباتیت طاری تھی۔ اس وقت مجھے یہ احساس نہیں ہوا کہ یہ معاشرہ کس قدر دشوار گزار ہے۔ جونہی مجھے احساس ہوا میرے بچے بڑے ہو چکے تھے اور پھر میں یہاں کے شب و روز کے مسائل میں پھنس کر رہ گیا۔''

''تم نے کبھی فرانس واپس جانے کے بارے سوچا ہے؟''

''یہ خیال ہمیشہ میرے ذہن نشیں رہتا ہے۔ جونہی میری اولاد اپنی روزی کمانے کے قابل ہوجائے گی میں یقیناً اپنے وطن لوٹ جاؤں گا۔'' اس کی آواز میں پختگی موجود تھی۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ وطن واپس لوٹ کر تم اطمینان کا سانس لے سکو گے؟''

''کیوں نہیں؟ میں فرانسیسی سماج کا حصہ ہوں وہاں لوگ پیسے کی نسبت سماجی رویوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اپنی زندگی میں خوشی کے لمحوں کا مزہ اٹھاتے ہیں۔ آج بھی مجھے اپنی جوانی کے دن ہلکے ہلکے یاد ہیں۔ وہ خوشی اور مسرت سے بھرپور تھے۔''

اس کی گفتگو بہت دلچسپ تھی۔

''جناب یہ ملک یہاں کے بھومی پتروں کے لیے ہے دوسروں کے لیے نہیں اور آنے والے پردیسی یہاں کبھی بھی زندگی کا مزہ نہیں لے سکتے۔'' وہ کہنے لگا۔

ٹیکسی کی رفتار کم ہونے لگی اور بالآخر وہ ایک مقام پر رک گئی۔ سامنے عمارت پر ''1915 فل ہیم'' جلی الفاظ میں لکھا ہوا تھا۔

جیسے ہی میں ٹیکسی سے باہر نکلا وہ کہنے لگا: ''شکریہ میرے دوست شاید ہم پھر کبھی ملیں!''

''شاید!''

وہ مسکرایا اور اس کی کار آگے بڑھ گئی۔

کیا یہ دنیا ایک پراسرار جگہ نہیں؟

بہار کا موسم تھا۔ چاروں اور پھول کھلے ہوئے تھے۔ ان کی بھینی بھینی مہک طبیعت میں جوش پیدا کر رہی تھی اور میں اس موسم کا مزہ لینے دیار غیر سے وطن آیا ہوا تھا۔

خاندان والوں کے ساتھ دن گہما گہمی میں گزر گئے اور وقت کٹنے کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ ذرا فرصت ہوئی تو دوستوں کا خیال آیا۔ میر النگوٹیا یار کنال ریگل پلازہ کے پاس رہا کرتا تھا۔ میں کنال سے ملنے اس کے گھر گیا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اس نے اپنی رہائش گاہ تبدیل کر لی ہے۔

جیسے ہی میں گھر پہنچا تو میرے چھوٹے بھائی سمیر نے پوچھا آیا میری

ملاقات کنال سے ہوئی؟ میں نے اسے بتایا کہ" وہ اپنا گھر بدل چکا ہے اور اب وہ کسی گران ویا نامی آبادی میں رہائش پذیر ہے!"

"کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ کنال نے گھر بدل لیا ہے؟"

"نہیں تو۔"

"کنال اپنے نئے گھر میں پچھلے سال اپریل سے رہ رہا ہے۔"

"لیکن مجھے تو کسی نے نہیں بتایا!!!!"

"تم نے شاید کسی سے پوچھا ہی نہیں؟"

"کنال ایک معمولی آمدن کا مالک ہے وہ اس مہنگی اور نئی آبادی میں کیسے رہ رہا ہے!"

"مجھے کچھ زیادہ علم نہیں ہے لیکن شہر میں اس بارے ایک کہانی گردش کر رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کی ترقی چین کے سفر کے بعد شروع ہوئی جہاں سے وہ

دولت کمانے کی کوئی ترکیب لے کر آیا ہے۔

وقت اڑتا رہا۔ مزید دو مہینے گزر گئے۔ کچھ ہی دنوں بعد مجھے واپس جانا تھا۔ میں نے سوچا چلو کنال سے ملا جائے۔ گران دیا نامی آبادی میں کنال کے گھر کو تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

کنال مجھے دیکھتے ہی مجھ سے بغلگیر ہو گیا اور پوچھنے لگا۔ ''تم کب آئے؟''

''میں دو ماہ قبل آیا تھا لیکن خاندانی مصروفیات کی بناء پر تم سے ملاقات نہ ہو سکی۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں فوراً میری طرف آنا چاہیے تھا۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔''

''معاف کرنا یار خاندانی مسائل ہی کچھ ایسے تھے کہ تم سے ملاقات کا بھی وقت نہیں ملا۔''

''چلو معاف کیا مگر آئندہ خیال رکھنا۔ کہو کیا پیو گے؟'' کنال کہنے لگا۔

''چائے کی ایک پیالی!''

اس نے خدمت گار کو چائے لانے کے لیے کہا۔

وہ کہنے لگا۔ ''تمہیں یہ جاننے کی خواہش تو ضرور ہوگی کہ میرے حالات میں تبدیلی کیسے آئی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''یقیناً؟ بتاؤ نا تم نے کامیابی کیسے حاصل کی؟''

''تمہیں یاد ہوگا کہ کچھ عرصہ قبل میں چین کی سیاحت کے لیے گیا تھا؟''

''گھر والوں نے بتایا تھا۔''

''چین میں قیام کے دوران ایک روز میں مشہور زمانہ دیوار چین کے گرد و پیش گھوم رہا تھا۔ وہاں پر ایک شخص نوادرات فروخت کر رہا تھا۔ مجھے بھی ان نوادرات میں دلچسپی ہو گئی۔ میں انہیں دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک کسی نے آواز

لگائی۔

''کیا تمہارا نام کنال ہے؟''

''جی ہاں! تم کون ہو؟''

اس کے چہرے پر ایک پراسرار مسکراہٹ ابھری اور وہ کہنے لگا۔ ''میں کئی دنوں سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ تمہیں تو یہاں تین دن پہلے آنا تھا پھر کیوں دیر ہوئی؟''

میں نے حیران ہو کر اس سے کہا۔ ''تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟''

اس نے مسکراتے ہوئے میرے ہاتھ میں ایک بنڈل تھما دیا۔ ''یہ تمہارے لیے ہے۔''

''یہ بنڈل کس نے بھیجا ہے؟''

''میرے مالک نے۔''

''اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں آنے والا ہوں؟''

''اس سلسلہ میں مزید گفتگو میرے مالک سے ہی کی جا سکتی ہے۔'' وہ کہنے لگا۔

ہماری بات چیت جاری تھی۔ اچانک کسی نے میرا نام پکارا۔ میں نے مڑ کر دیکھا لیکن کوئی شناسا دکھائی نہ دیا۔ اس دوران وہ اجنبی اچانک غائب ہو گیا۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے اس بنڈل کو کھولا۔ نفیس انداز میں سجایا ہوا بلی کا ایک خوبصورت مجسمہ برآمد ہوا۔ میں حیران تھا کہ اس اجنبی ملک میں میرے لیے یہ تحفہ کس نے بھیجا ہے؟

وطن واپسی پر میں نے اس مجسمہ کو بیٹھک کی مینٹیل پر رکھ دیا۔ تمہیں تو وہ جگہ یاد ہی ہو گی۔

''وہی جگہ نا جہاں تمہارے جیتے ہوئے انعامی کپ رکھے ہوئے تھے۔''

''جی ہاں۔ بلی کا مجسمہ میری سوچ کے خانوں سے نکل چکا تھا۔ ایک

روز میری ماں نے مجھے ایک ہزار روپیہ والا انعامی بونڈ دیا اور کہا کہ انعامی فہرست میں دیکھو آیا ہمارا بونڈ نکلا ہے یا نہیں؟ انعامی فہرست کے مطابق ہم پہلا انعام جیت چکے تھے۔اس کی مالیت دس لاکھ روپے تھی۔

''انعامی رقم نے ہماری زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ایک روز میں نے خواب میں بلی کے مجسمے کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔وہ کہنے لگا۔تم خوش ہوتا؟ اس اثناء میں میری آنکھ کھل گئی۔میں نے یہ خواب کسی کو نہیں بتایا۔

دھیرے دھیرے میرے کاروبار میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ہماری زرعی زمین کے جھگڑے کا فیصلہ ہمارے حق میں ہو گیا۔میرا چھوٹا بھائی ایک نا قابل علاج بیماری سے شفایاب ہو گیا۔اور بہت سی اچھی اچھی باتیں ہمارے حصہ میں آئیں۔''

''کیا بلی کے مجسمے کی وجہ سے تمہاری زندگی میں انقلاب آیا؟''

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا! کیونکہ بلی کا مجسمہ اب میرے پاس نہیں ہے!''

''کیا؟''

''جی ہاں! کچھ روز قبل ہمارے نوکر نے صفائی کے دوران اس مجسمہ کو توڑ دیا۔''

''فکر کیوں کرتے ہو تمہاری زندگی کے ڈھنگ تو بدل ہی چکے ہیں!''

وہ کہنے لگا۔''کہانی میں ابھی موڑ باقی ہے۔میں نے اسٹاک کے کاروبار میں اچھی خاصی رقم لگائی ہوئی تھی۔سٹاک مارکیٹ یکدم مندی کا شکار ہو گئی اور میری تمام رقم ڈوب گئی۔اب ہمیں اس مکان کو بھی بیچنا پڑ رہا ہے تا کہ قرض خواہوں کی رقوم کو واپس کیا جا سکے اور ہم اپنے آبائی مکان میں واپس جا رہے ہیں۔''اس کی آواز جذبات سے رندھی ہوئی تھی۔

میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا اور جانے کے لیے اجازت چاہی۔

میں بھی افسردہ اور غمگین تھا۔کنال کی کہانی میرے لیے ایک جادوئی کہانی تھی۔میں سوچ رہا تھا کہ جس دنیا میں ہم رہ رہے ہیں وہ اتنی پراسرار ہے کہ یہاں سب کچھ ممکن ہے!

☆......☆......☆

F

Azim, Zafar

Prem git ki bikhri hui khushbu. - Lahore: Sang e Mil Publications. 2010.
- 183p.. - ISBN:9693523008

Urdu text: Short stories

BookID: 101/006, VZ No. vz10101101, Price: £13.95

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ ''کتب خانہ'' میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

مجموعے

مجموعہ محمد حسن عسکری: (انسان اور آدمی، ستارہ یا بادبان، وقت کی راگنی، جھلکیاں ...)	محمد حسن عسکری
مجموعہ شفیق الرحمٰن: پچھتاوے، مزید حماقتیں، دجلہ، دریچے، انسانی تماشا	شفیق الرحمٰن
مجموعہ شفیق الرحمٰن: کرنیں، شگوفے، لہریں، مدوجزر، پرواز، حماقتیں	شفیق الرحمٰن
مجموعہ احمد ندیم قاسمی: در و دیوار، گھر سے گھر تک، کپاس کا پھول، کوہ پیما، آبلے...	احمد ندیم قاسمی
مجموعہ احمد ندیم قاسمی: آنچل، آس پاس، بازارِ حیات، بگولے، برگِ حنا، نیلا پتھر، سناٹا	احمد ندیم قاسمی
مجموعہ قرۃ العین حیدر: آگ کا دریا، چاندنی بیگم، میرے بھی صنم خانے	قرۃ العین حیدر
مجموعہ ڈاکٹر محمد یونس بٹ: بٹ پارے، بٹ تمیزیاں، مزاح پرسی، نوک جوک...	ڈاکٹر محمد یونس بٹ
مجموعہ انتظار حسین: گلی کوچے، کنکری، دن اور داستان، آخری آدمی، شہرِ افسوس، کچھوے، خیمے سے دور...	انتظار حسین
مجموعہ عبداللہ حسین: اداس نسلیں، باگھ، قید، رات، نشیب	عبداللہ حسین
مجموعہ منشی پریم چند: گئودان، غبن، میدانِ عمل (ناول)	منشی پریم چند
مجموعہ منشی پریم چند: (افسانے)	منشی پریم چند
مجموعہ منشی پریم چند: جلوۂ ایثار، [illegible]، چوگانِ ہستی، منورما، بیوہ، روٹھی رانی (ناول)	منشی پریم چند
مجموعہ مرزا ہادی حسن رسوا: (امراؤ جان ادا، مرقع لیلیٰ مجنوں، اختری بیگم، شریف زادہ)	مرزا ہادی حسن رسوا
مجموعہ راشد الخیری: (صبحِ زندگی، شامِ زندگی، شبِ زندگی، نوحۂ زندگی، فسانۂ سعید، نالۂ زار)	راشد الخیری
ناول افسانے: (تمغۂ شیطانی، ماہِ عجم، عروسِ کربلا، شاہین و دراج، [illegible]، آفتابِ دمشق ...)	راشد الخیری
مجموعہ عظیم بیگ چغتائی: مضامین، داستان، ڈرامے، افسانے	تدوین: صلاح الدین محمود
مجموعہ عظیم بیگ چغتائی: ناول، ناولٹ	تدوین: صلاح الدین محمود
مجموعہ مظہر الاسلام	مظہر الاسلام
مجموعہ عاشق حسین بٹالوی: (تاریخ اور افسانہ)	عاشق حسین بٹالوی
مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد: (ابن الوقت، توبۃ النصوح، بنات النعش، فسانۂ مبتلا...)	ڈپٹی نذیر احمد
مجموعہ ڈاکٹر انور سجاد	ڈاکٹر انور سجاد
مجموعہ سید رفیق حسین (آئینۂ حیرت، افسانے، مضامین، شخصی تاثرات)	سید رفیق حسین
مجموعہ آغا حشر (ڈرامے)	آغا حشر کاشمیری
مجموعہ نثار عزیز بٹ (نگری نگری پھرا مسافر، نے چراغے نے گلے، کاروانِ وجود، دریا کے سنگ)	آغا حشر کاشمیری

Rs. 350.00

www.sang-e-meel.com

ISBN 10 969-35-2300-8
ISBN 13 978-969-35-2300-3
www.sang-e-meel.net